ASL-278	—	Maths fifth (5th) Primary [illegible] (in Urdu) 1953 — 190 pages.
ASL-279	—	Elements of Calculus Sodhi-Chand, SP Arora, HL Gupta Universal Publishing Company Delhi 1956 222 pages
ASL-280		Urdu Course اردو کورس ([illegible]) Prof. Syed Ihtisham Husain Allahabad J&K University (1968) — 208 pages
ASL-281		Qawaid-i-farsi قواعد فارسی 156 pages (Persian grammar in Urdu language)

پھول تھی جو کھلی فضا میں
پھول بنی وہ سدا رہے

ASL-278	— Maths fifth primary (5th) [illegible] (in Urdu) 1953 — 190 pages.
ASL-279	— Elements of Calculus Gopi Chand, S.P. Arora, H.L. Gupta universal publishing company Delhi 1956 222 pages
ASL-280	Urdu Course اردو کورس ([illegible]) Prof. Syed Ihtisham Husain Allahabad J&K university (1968) — 208 pages
ASL-281	Qawaid i- [illegible] farsi قواعد فارسی 156 pages (Persian grammar in Urdu language)

منظور شدہ اردو کورس برائے امتحان بی۔ اے (سال اوّل)

اردو کورس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید عابد حسین، جامعہ نگر نئی دہلی

مرتّب

پروفیسر سیّد احتشام حسین

الہ آباد یونیورسٹی۔ الہ آباد

جموں و کشمیر یونیورسٹی سری نگر

قیمت: تین روپیہ پچھتر پیسے

شائع کردہ:
رجسٹرار جموں و کشمیر یونیورسٹی سری نگر

پہلا ایڈیشن	سنہ ۱۹۶۲ء	تعداد ۱۰۰۰
دوسرا ایڈیشن	سنہ ۱۹۶۵ء	تعداد ۱۰۰۰
تیسرا ایڈیشن	سنہ ۱۹۶۶ء	تعداد ۱۰۰۰
چوتھا ایڈیشن	سنہ ۱۹۶۸ء	تعداد ۱۰۰۰

(مطبوعہ مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ)

کاغذ:- ۲۰"×۳۰" - ۲۸ پونڈ سفید

عرضِ مرتب

اردو نظم و نثر کا یہ انتخاب جموں و کشمیر یونیورسٹی کے مجوزہ نصاب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے اور اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ بی۔ اے کا جو سہ سالہ ڈگری کورس اب جاری کیا جا رہا ہے اُس میں اُردو ادب کے نہ صرف اعلیٰ نمونے ہی ہوں جن سے طلبہ کو واقفیت حاصل ہو بلکہ اُن کے مطالعہ سے ادبی ذوق کا تدریجی ارتقا بھی ہو۔ نظم اور نثر دونوں کے انتخاب میں یہی بات مدِنظر رہی ہے کہ جو ادب پارے نصاب میں شامل کیے جائیں وہ دلچسپ بھی ہوں، اعلیٰ بھی اور طالب علم میں صحیح

ادبی ذوق پیدا کرنے میں معین بھی ہوں۔ صفحات کی پابندی کی وجہ سے بہت سے اہم مصنفین اور شعراء کی تحریریں شامل نہیں کی جا سکیں لیکن یہ خیال ہے کہ اس سلسلہ کے دوسرے درجوں کی تیاری کرتے ہوئے وہ دوسرے ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے بھی روشناس ہو گا۔

یہ ظاہر ہے کہ محدود جگہ میں شعر و ادب کے تمام اصناف کے نمونے بھی نہیں دئے جا سکتے اس وجہ سے آپ صرف چند اہم اصناف ہی اس مجموعہ میں پائیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے آخر میں دو مضامین ایسے شامل کر دئے گئے ہیں جن سے اردو ادب کی پوری تاریخ کے خاکے اور مشہور فن کاروں سے واقفیت حاصل ہو جائے گی اور ادب کے ارتقا کا صحیح تصور قائم ہو سکے گا۔ یہ آخری دو مضامین توسیعی مطالعہ اور حوالہ کے لئے ہیں، متن میں شامل نہیں ہیں۔

اساتذہ سے گزارش ہے کہ وہ ہر مضمون اور نظم کو پڑھانے سے پہلے اس کے مصنف اور مضمون کے موضوع کے متعلق طلبہ کو ضروری باتیں بتا دیں اور اس سلسلہ میں انھیں ایسی چیزیں پڑھنے کی ترغیب دیں جن کے مطالعہ سے اس مضمون کے سمجھنے میں مدد

مل سکتی ہو۔ ہر مضمون یا انتخاب نظم کی ابتدا میں مصنفوں اور شاعروں کے مختصر حالات دے دیئے گئے ہیں اور چند ایسی کتابوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے جن سے مفید مطالعہ میں مدد لی جا سکتی ہے۔ امید ہے کہ یہ انتخاب اپنا مقصد پورا کرے گا۔

یکم دسمبر ۱۹۶۳ء

مرتّب

ASL-278	—	Maths fifth primary [illegible] (in Urdu) 1953 — 190 pages.
ASL-279	—	Elements of Calculus Sobha-Chand, SP Arora, HL Gupta Universal Publishing Company Delhi 1956 222 pages
ASL-280		Urdu Course اردو کورس ([illegible]) Prof. Syed Ihtisham Husain Allahabad J&K University (1968) — 208 pages
ASL-281		Qawaid-i-Farsi قواعد فارسی 156 pages (Persian Grammar in Urdu language)

اے خدایا ایسی صرف تو ہی میری مدد کرنے
والا ہے۔ میری مدد کر۔
اے خدا میری ڈولتی ہوئی کشتی اب پار کرا دے

Shaesta

فہرست مضامین

(حصہ نثر)

(حصۂ نظم)

عام مطالعہ کے لئے ادبی مضامین

خوشی کی لہر جاگ اُٹھی

حصۂ نثر

ASL-278 — Maths fifth (5th) primary [illegible]
(in Urdu) 1953 — 190 pages.

ASL-279 — Elements of Calculus
Sohi Chand, SP Arora, HL Gupta
Universal Publishing Company Delhi 1956
222 pages

ASL-280 Urdu Course اردو کورس ([illegible])
Prof. Syed Ihtisham Husain Allahabad
J&K University (1968) — 208 pages

ASL-281 Qawaid-i-Farsi قواعد فارسی
156 pages (Persian Grammar in Urdu language)

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء)

مرزا اسد اللہ نام، اسد اور غالب تخلص۔ نجم الدولہ دبیر الملک خطاب۔ مرزا غالب ایبک ترکوں کے ایک خاندان میں اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ باپ دادا کا پیشہ سپہ گری تھا لیکن مرزا نے تلوار کی جگہ قلم سنبھالا۔ باپ اور چچا کے انتقال کے بعد کچھ دن خوش حال ننہال میں گزرے، تیرہ سال کی عمر میں شادی ہوگئی اور زندگی کی الجھنیں شروع ہوگئیں۔ خاندانی پنشن، جس کا وہ خود کو حقدار سمجھتے تھے، دوسروں میں بٹ گئی اس کے لئے انھیں بڑی جدوجہد کرنی پڑی، اس سلسلہ میں کلکتہ بھی گئے، لکھنؤ میں بھی قیام کیا لیکن وہ فارغ البالی واپس نہ آئی جو ابتدائی زندگی میں رہ چکی تھی۔ غالب نے اپنے خطوں

میں ان تمام باتوں کا ذکر بڑے دلکش اور پُر اثر انداز میں کیا ہے۔ اس کے داخلی اثرات اُن کی شاعری میں بھی ظاہر ہوئے ہیں۔
غالبؔ بڑے کثیرالاحباب اور ملنسار انسان تھے، مزاج میں شگفتگی اور ذہن میں جودت اور ذکاوت تھی۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے کتنی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ فارسی زبان سے انھیں غیر معمولی واقفیت تھی۔ نظم و نثر کا بڑا حصہ فارسی ہی میں ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ شروع میں وہ فارسی کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ خط کتابت فارسی ہی میں کرتے تھے اور اپنی فارسی دانی ہی پر فخر کرتے تھے لیکن یہ اردو زبان و ادب کی خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے اردو میں خطوط بھی لکھے اور شاعری بھی کی اور اس طرح اردو ادب کو وہ سب کچھ دیا جو کوئی دوسرا نہ دے سکا۔ اپنی خط نویسی کے سلسلہ میں انھوں نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ خط نہیں ہیں، زبانِ قلم سے باتیں ہیں، مراسلہ نہیں مکالمہ ہے۔ رسمی نامہ نگاری نہیں مدعائے دل کی تصویر ہے، یہ باتیں غلط نہیں ہیں۔ اُن کے اردو خطوط اپنی سادگی، شگفتگی، دلکشی تاریخی اور سوانحی مواد، ادبی معلومات اور بے تکلف اسلوب بیان کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غالبؔ کی اردو نثر میں خطوں کے علاوہ کچھ دیباچے، تقریظیں اور مختصر رسائل بھی ہیں۔ لیکن اعلیٰ نثر کا نمونہ خط ہی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ان کے خطوط

کے کئی مجموعے شلاً اردوئے معلیٰ، عودِ ہندی، مکاتیبِ غالب، خطوطِ غالب، نادر خطوطِ غالب شائع ہو چکے ہیں۔ اس انتخاب میں چند خطوط، خطوطِ غالب (مرتبہ مہیش پرشاد) سے لئے گئے ہیں غالب کے متعلق مزید معلومات کے لئے 'یادگارِ غالب' (حالی)، حکیم فرزانہ (محمد اکرام) مکاتیبِ غالب (عرشی رامپوری) اردو خطوط نویسی (شمس الرحمٰن) اور داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) پڑھنا مفید ہوگا۔ ادبی خطوطِ غالب (مرزا محمد عسکری) اور نادر خطوطِ غالب (آفاق حسین) کے دیباچوں سے بھی غالب کی خطوط نویسی کے متعلق اچھی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

خطوطِ غالب

(میر مہدی حسین مجروح کے نام)

(۱)

سید صاحب!

تمہارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو، لیکن زمانہ وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی سے ہی نہیں ہے۔ خط سے معلوم ہوا تو کیا معلوم ہوا کہ ڈھائی سو جُئے ان دنوں میں ڈھائی روپے بھی بھاری ہیں، ڈھائی سو کیسے؟ سبحان اللہ! باوجود

اس تہیدستی کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپے گئے بلا سے! آبرو بچی جان بچی۔ اب میر سرفراز حسین کو چاہیے کہ الور چلے جائیں۔ شاید نئے بندوبست میں کوئی صورت نوکری کی نکل آئے۔ میری دعا کہو اور یہ کہو کہ اپنا حال اور اپنا قصہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو لکھیں۔ پنشن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو تو کہوں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتے ہیں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا، کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہرحال اتنا سنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور صاحب کمشنر بہادر کی رائے میں پنشن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم، نہ کسی کو خبر۔

میاں! کیا باتیں کرتے ہو، میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں، جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا چھپواؤں گا؟ منشی امید سنگھ، اندور والے دلی آئے تھے۔ بہ اتفاق معرفت مجھ سے ملا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا، چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال "تفتہ" تھا۔ اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمے لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ "۸ آنے" فی جلد قیمت ٹھہری، پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں، پچیس روپے چھاپے خانے میں بہ طریق ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بہ شمول سعی منشی ہرگوپال "تفتہ" چھاپنا شروع کیا۔

آگرے کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اس پچاس جلد میں شاید پچیس چھبیس منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ پرسوں خط تمہارا آیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ ایک فرما چھاپا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اس اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔ بھائی میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خاں کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیوں کر لکھتا؟ اُن کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا؟ منشی امید سنگھ اندور جانے والے تھے اگر ختم کر کر مسودہ اُن کے سامنے آگرے نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟

اہلِ خطہ کا حال از روئے تفصیل مجھ کو کیونکر معلوم ہو؟ سنتا ہوں کہ دعویِٔ خون پیش کیا چاہتے ہیں۔ سودا ہو گیا ہے۔ مسودہ ہو رہا ہے۔ بلنگ صاحب کے جورہیں ٹکڑے اُڑ گئے! گو یہ نہ مدعی نہ ہوئے قصاص نہ لیا۔ اب ایک ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا؟

اے سبزۂ سیر رہ ازجور پایمالی؟
در کیش روزگاراں گل خون بہا نہ دارد

خیر جو ہونا ہے ہو رہے گا بعد وقوع ہم بھی سُن لیں گے تم اتنا
کیوں دل جلا رہے ہو۔ (۱ اکتوبر سنہ [illegible]ء)

(۲)

واہ واہ سید صاحب۔
تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے، نثر میں خود نمائیاں کرنے
لگے۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں، مگر جاڑے
نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں،
تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں،
سخن پردازی کروں۔ بھائی تم تو اردو کے مرزا "قتیل" بن گئے ہو۔
اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رودِ نیل بن گئے ہو۔ کیا
"قتیل"، کیا رودِ نیل، یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں۔ لو سنو! اب تمہاری
دلی کی باتیں ہیں۔ چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے
حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر
بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ
چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم خاص و عام کچھ نہیں۔ پنشن داروں سے
حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے
ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی۔
دیکھیے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے اردوئے قیاس جیسا کہ
دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اڑا دی ہے سو سارے شہر

میں مشہور ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر روپے دیے جائیں گے۔

خیر آج بدھ کا دن، ۲۲ دسمبر کی ہے۔ اب شنبے کو بڑا دن اور اگلے شنبے کو جنوری کا پہلا دن ہے۔ اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس خط کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

میری جان، سرفراز حسین تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو؟ اب صورت کیا ہے اور آئندہ عزیمت کیا ہے؟

اشرف علی صاحب آپ تو دائر سائر تھے۔ پانی پت میں مقیم کیوں کر ہو گئے؟ کچھ لکھیے تو میں جانوں۔

میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاق دیدار۔

میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جائے اور بلا لائے حضرت آئیے سلام علیکم، مزاج مبارک، کہیے مولوی مظفر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز حسین تم، اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں! میں کہیں، تم کہیں، وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیونکر تم سے بے ادبیاں کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب یکجا ہوں گے تو انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے! کیوں کر یکجا ہوں گے؟ دیکھیے زمانہ اور کیا دکھائے گا۔ اللہ! اللہ! اللہ!

(بدھ ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء)

(۳)

سید صاحب،

نہ تم مجرم، نہ میں گنہگار، نہ تم مجبور، نہ میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو، میری سرگذشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفیٰ خاں، بہ میعادِ سات برس کے قید ہوگئے تھے، سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز حکم کچھ نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں مجرّد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ اُن کو دیکھا، چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتے کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے، مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدّت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اُس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے

یہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں، یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے، آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جماعہ دار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی، تو مجھے نقشہ میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت بھاگا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا، اور نہ نکالا گیا۔ کرنیل براؤن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اُس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکمِ وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جماعہ دار نے اپنے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان، دکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو۔ اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدرِ مقدور نذرانہ دے۔ اُس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔

نورچشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی، اس میں سے وہ جو چاہیں قبول کر لیں۔ [بدھ ۲ر فروری ۱۸۵۹ء]

(۴)

میر مہدی جیتے رہو۔

آفریں، صد ہزار آفریں! اردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سنو دلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم، پانی پت۔ انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے میرے پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کما حقہٗ سمجھ لو۔ ایک طرز خاص پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کے پنشن کے کل چڑھے ہوئے روپئے کے یکمشت پانے کی اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم حکم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ سو یہاں اس کی تعمیل بہ طرز مناسب ہو گئی۔ اب پنشن و فیفنے میں سب روپیہ مل جائے گا، اور ہاں صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپیہ خزانے سے منگوا لو۔ میں نے کہا، صاحب یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپیہ

دلواتے ہو؟ فرمایا کہ تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا، اوروں کو یہ بات برسوں میں بھی نہ میسر آئے گی۔ میں چپ ہو رہا۔ آج دوشنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپیہ منگالوں، پرپار ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ تم کو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے۔ مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ "دستنبو" منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے۔ اور اس میں کیا ہے۔ چنانچہ حاکم دہلی نے ایک کتاب بھی کہہ کر مجھ سے مانگی اور میں نے دی۔ اب دیکھوں حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے۔

اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میر سرفراز حسین، میرن صاحب، میر نصیر الدین کو دعا۔ [سنہ ۱۲۷۵ھ، سنہ ۱۸۵۹ء]

(۵)

سید، خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا ہے۔ ایک غریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر نہاسا نکلا ہے، تم کو سرمایۂ آرائشِ گفتار ہم پہنچا ہے۔ میری ان کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو۔

بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے سمجھ میں کسی کی نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی ہے، آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہوجاتی ہے۔ اس مہینہ میں برابر یہی صورت رہی ہے۔ آج ۲۷ مارچ کی ہے پانچ چار دن مہینہ میں باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔

مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غمزدگی میں ایک گونہ خوشی، اور کیسی بڑی خوشی دی ہے! تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا خط مقام الٰہ آباد سے بہ سبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ پنشن کے ملنے کا بھی حکم آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع بڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔

میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کو دعا کہہ دینا اور یہ خط دکھا دینا۔

[۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء]

مرزا علاء الدین خاں علائی، نسیمی کے نام

سبحان اللہ ہزار برس تک نہ پیام بھیجا، نہ خط لکھا، اور پھر لکھا تو سراسر غلط لکھا۔ مجھ سے کتاب مستعار مانگتے ہو۔ یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ "دساتیر" اور "برہان قاطع" کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ ازاں جملہ برہان قاطع تم کو دے چکا ہوں "دساتیر" میرا ایمان و حرزِ جان ہے۔ اشعار تازہ مانگتے ہو۔ کہاں سے لاؤں۔ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا۔ کبھی کبھی کہہ دیتا تھا۔ خلعت پا لیتا تھا۔ خلعت موقوف، کہنی متروک۔ نہ غزل نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں۔ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آجاتے ہیں۔ اصلاح پا جاتے ہیں۔ یاد رکھنا اور مطابق واقعہ سمجھنا۔ تمہارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش، اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے۔ اردو کا دیوان رام پور سے لایا ہوں اور وہ آگرے گیا ہے۔ وہاں منطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمہارے پاس بھی پہنچ جائے گا۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟

مرقومہ روز دوشنبہ ۲ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء

(۲)

جان غالب،

تم ثمر نو رسس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشیں اس نہال کا رہا ہوں کیونکر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے؟ وہی دید و اد بد، اس کی دو صورتیں ہیں تم دلی میں آؤ، یا میں لوہارو آؤں، تم مجبور، میں معذور، خود کہتا ہوں کہ عذر زنہار مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے:-

سنو! عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم" اور پھر آپ جواب دیتا ہے للہ الواحد القہار ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب سنہ ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا۔ اور اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر و نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے میں سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے

کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ
قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار
ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت
یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گذشتہ بیڑی کو زاویہ زندان
میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا
رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب
عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو
نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال
ہے کہ اسی ماہ حجہ سنہ ۱۲۷۷ء میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے
تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات
سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔

جون سنہ ۱۸۶۱ء

مولانا محمد حسین آزاد

(سنہ ۱۸۳۲ء تا سنہ ۱۹۱۰ء)

محمد حسین المتخلص بہ آزاد دہلی میں سنہ ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا محمد باقر دہلی کے ایک باا ثر عالم تھے۔ انھیں نے دہلی اردو اخبار کے نام سے سنہ ۱۸۳۶ء میں ایک اخبار نکالا تھا جسے اردو صحافت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ محمد حسین آزاد قدیم و جدید کے سنگم پر تھے۔ ایک طرف باپ کی تعلیم و تربیت اور استاد ابراہیم ذوق کی شاگردی، دوسری طرف دہلی کالج کا فیض اور ان انگریزوں اور ہندوستانیوں سے علمی تعلقات جو مغربی علم و ادب سے واقف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد حسین آزاد ادب جدید کے رہنما بن گئے۔

غدر سنہ ۱۸۵ء میں آزاد کے والد مولانا محمد باقر کو انگریزی حکومت نے گولی مار دی، آزاد بے سروسامانی سے نکلے لکھنؤ، دکن گئے سنہ ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچ کر سررشتہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ درسی کتابیں لکھ کر مقبولیت حاصل کی۔ کابل، بخارا اور ایران کا سفر کیا اور زندگی کے تجربوں کے ساتھ زبان کے مطالعہ کا موقع بھی ملا۔ کرنل ہالرائڈ کے مشورے سے لاہور میں انجمن پنجاب

کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد اردو شاعری میں انقلاب پیدا کرنا تھا۔ ۱۸۷۴ء میں حالی بھی لاہور آگئے اور انجمن پنجاب کے مشاعرے خوب چمکے۔ آزاد دہلی کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر بھی رہے۔ ۱۸۸۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء کے بعد سے دماغی امراض شروع ہوئے۔ کچھ دنوں تک اس حالت میں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس دوران میں کوئی اہم کام انجام نہیں پایا۔ ۱۹۱۰ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔ اُن کی اہم تصانیف میں آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری، سخندانِ فارس، نگارستانِ فارس اور قصصِ ہند ہیں۔

سرسید، حالی، نذیر احمد اور شبلی کے ساتھ مل کر آزاد اردو کے عناصرِ خمسہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ نئی شاعری کے بانی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بڑے محقق، اہم نقاد، اعلیٰ انشاپرداز، باشعور مورخ اور ماہرِ زباندان تھے۔ اُن کی شاعری صرف نئی ہونے کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے ورنہ اُن کی نثر شاعری سے زیادہ دلآویز، رنگین اور زرنگار معلوم ہوتی ہے۔ محقق اور نقاد کی حیثیت سے ان کے سخت سے سخت نکتہ چین بھی اُن کے اسلوب کے جادو کو تسلیم کرتے ہیں۔ بعض نقاد اُن کے اسلوب کو کسی قدر مصنوعی قرار دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اُن کی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ تھی۔ ان کی تحریر آمد

ہی آمد ہے اور انشاپردازی کے حسن سے مالا مال ہے۔ الفاظ ان کے ہاتھ میں گیلی مٹی کی طرح ہیں، جن سے وہ اپنے طور سے کام لیتے ہیں۔ اس انتخاب میں ان کا ایک مضمون نیرنگ خیال سے لیا گیا ہے۔ آزاد کی ادبی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے حسب ذیل تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ نیرنگ خیال کا دیباچہ، منثورات (حسرت کیفی)، آواز دوست (مہدی)، منتخبہ مضامین، داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری)، اردو کا بہترین انشاء پرداز (سعید انصاری)

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

ہند قدیم کے مورخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ شہسواری، تیراندازی اور راست بازی۔ شہسواری اور تیراندازی تو بیشک سمجھ میں آجاتی ہوگی۔ مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آکر ان کے دلوں پر شیشہ جادو مارتا تھا تو یہ اس چوٹ سے اس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بڑی جگہ ہے۔ چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشت خاک کو اس دیو آتش زاد کی

اطاعت کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اگر جرم ہو جاتا ہے کہ اگر قبول لے تو مرنا پڑتا ہے۔ ناچار مکرنا پڑتا ہے کبھی اَبلہ فریبی کر کے جاہلوں کو پھنسانا ہے، جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکروہ دغا ان کی چاٹ لگاتا ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے رستہ میں ہر دم ثابت قدم بنے رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لئے سکھنے والے بھی ضرور رہیں کیونکہ خوشامد جس کی دکان میں آج موتی برس رہے ہیں اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بیچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابعدار امید کا بھوکا آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست محبت کا بندہ ہے۔ اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں نہ ڈرپوک۔ انھیں باتوں ہی باتوں میں خوش کر دینے کا شوق ہے اسی طرح جب جلسوں میں نمود کے گھوڑے دعوے کی ڈاگ کی آواز سے کسی میدان آگے نکل جاتے ہیں تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں کچھ امید کچھ ڈر کچھ مروت سے غرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ ساتھ کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عملداری دور دور تک پھیل گئی ہے۔ بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوت عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی

خود اس مردار سے متنفر ہیں وہ بھی اسی کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب کسی شے پر دل آجاتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی برا نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے حضرت انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا اس کو جاننا بھی نہیں چاہتے جو پسند نہیں آتی اس کا ذکر بھی نہیں سنتے۔ اس کان سنتے ہیں اس کان نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں تاکہ لوگ اسے سنتے سنتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزت

دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیو زاد ایک سفلہ نابکار تھا۔ حقِ تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس پرست اس کی ماں تھی اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں مسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں ساکنان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکا دیا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعویدار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اٹھے تو چونکہ بزرگان آسمانی کو ان کی قسمتی کی ابتدا و انتہا سے معلوم تھی سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہوتا ہے؟

سچ کے زور و طاقت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکہ صداقت کبھی کہ حقیقت کے دعوے تھے اٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی تھی۔ اسی واسطے بلند اٹھی۔ اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے فتح و اقبال نور کا غبار اڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے تحمل و ادراک ہمراز تھا۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی۔ اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ

آتی تھی مگر استقلال رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اٹھاتا تھا دس قدم پیچھے ہٹتا نظر آتا تھا۔ اس کے سبب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتے سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

زود رنج دیوزاد اگرچہ بے پڑھے لکھے ہیں طاق تھا مگر ہر بات کی تصدیق کرتا اور رستے سے ہو کر پھیلتا تھا تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا و ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اپنے ساتھ لئے تھیں اور چونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا اس لئے لاچار تھا۔ مگر وہ تابعداروں کی طرح ان کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں ان کی بے معنی تھیں اور کام بھی الٹ پلٹ بے اوسان تھے کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتح یاب تو جلد ہو جاتا تھا۔ مگر ٹھہر نہ سکتا تھا۔ ہوا و ہوس اس کے یار وفادار تھے اور اگر چھوٹے تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آ پڑتی تھی اس وقت زود رنج دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لئے ہر بادل کا دھواں دھار بکھیر لپیٹ لیتا تھا۔ لاف و گزاف کو حکم دیتا کہ نفیری اور ڈھول کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دے ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ وہ اپنے ہاتھ میں طراری کی تلوار بائیں ہاتھ میں حیا کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نمائشوں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس دائیں بائیں دوڑتے

بھرتے تھے دل کی ہٹ دھرمی۔ بات کی پچ پیچھے سے زور لگاتے تھے۔ غرض جبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا اور باوجود اس کے ہمیشہ یہی چاہتا کہ دور دور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھار کر دیتا تھا۔ مگر وہ بھی بادہوائی اٹکل پچو "بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا دم بدم جگہ بدلتا تھا کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا۔ تو جھوٹ تاڑ جاتا تھا ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی "تلوار نہ تھی مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعب خداداد کا خود سر پہ دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتحیاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک بیحیائی کی ڈھال منھ پر لے ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ بھیڑیا دھسان زمین پر گھسٹتے پھرتے تھے۔

ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی مگر سانچ کو آنچ نہیں زخم جلد بھر آتے تھے اور وہ جھوٹا بکار جب زخم کھاتا تھا تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا۔

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربے میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھہروں اس نے دغا بازی اور شعبدہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے

کے لئے ایک سڑک تیار کرو۔ مگر اس طرح کے ایچ پیچ اور ہیر پھیر
دے کر بناؤ کہ شاہ راہ صداقت جو خطِ مستقیم میں ہے اس سے
کہیں نہ ٹکرائے چنانچہ جب اس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اسی
رستے سے جدھر چاہتا تھا نکل جاتا تھا۔ اور جدھر سے چاہتا تھا پھر
آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اس نے ساری دنیا پر حملے کرنے شروع کر دئے
اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا
لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں سچ پاتا تھا ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا
اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فراروائی سے بہت خوش
ہوتے تھے۔ اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا تو بڑی گھاتوں سے مقابلے
کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی سب اپنی کمر پر
اس میں جکڑ لیتے تھے کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے
مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں ٹھہرتے تھے اور ثابت
کر کے ہٹتے تھے۔ پھر ادھر ملکہ نے منہ پھیرا ادھر باغی ہو گئے۔ ملکہ جب
آسمان سے نازل ہوئی تھی تو سمجھتی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے
خوش ہوں گے جو بات سنیں گے اسے مانیں گے اور حکومت میری تمام
عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائے گی۔ مگر یہاں دیکھا کہ گذارا بھی مشکل
ہے لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں اور
اس میں بھی شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی مگر بہت تھوڑی

تھوڑی اس پر بھی یہ دشواری تھی کہ ذرا اس طرف سے ہٹی اور پھر بد عملی ہو گئی۔ کیونکہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا دشمن کے زیر علم جا موجود ہوتے تھے ہر چند ملکہ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی۔ کیونکہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا، مگر جب بار بار ایسے باجی کمینے کو اپنے مقابلے پر دیکھتی تھی، اور اس میں سوائے مکر و فریب اور کمزوری و بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کے نام نہ پاتی تھی، تو گھٹتی تھی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے ناامید ہوئی تو غصہ ہو کر اپنے باپ سلطان آسمانی کو لکھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلا لیجئے۔ دنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں، انھیں میں رہا کریں اپنے کئے کی سزا آپ پالیں گے سلطان آسمانی اگرچہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا تو جہاں اندھیرا اور تمام عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس خیال سے اس کی عرضی نامنظور کی ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بد اصولوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی اس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے:۔

(۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرمانروائی دنیا میں ہر دل عزیز نہیں؟

(۲) کیا تدبیر ہے جس سے اس کے آئین حکومت کو جلد اہل عالم میں رسائی ہو اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو؟
کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدر انجمن نے اتفاق رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دھوؤں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہے جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔ کبھی ایسے فساد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دورا ندیشی اور اصلاح وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ بس اُسے چاہئے کہ جس طرح ہو سکے اپنی سختی اور تلخی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہوگا لوگ اس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے کیونکہ دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اُس کے برخلاف ہے اول تو اس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اس کی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں انھیں سوائے عیش و آرام کے دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہروپیا ہے جو صورت سب کو بھائے وہی روپ بھر لیتا ہے اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔ غرض اہل انجمن نے صلاح کر کے ملکہ کے طرز لباس بدلنے

کی تجویز کی۔ چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا۔ جیسا کہ جھوٹ پہنا کرتا تھا اور وہ پہن کر لوگوں کو چل دیا کرتا تھا۔ اس جامہ کا مصلحت زمانہ نام ہوا۔ چنانچہ اس خلعت کو زیب تن کر کے ملکہ پھر ملکہ گیری کو اٹھی۔ جس ملک میں پہنچی اور آگے کو رستہ مانگتی ہوا ہوس حاکم وہاں کے اسے فروغ شاہ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گزرانتے۔ ادھر اس کا دخل ہوا ادھر ادراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اتار لیا۔ جامہ کے اترتے ہی اس کی اصلی روشنی اور ذاتی حسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔

چنانچہ اب بھی وقت آگیا ہے یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کر کے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لیے مضر سمجھنے لگے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے جب تبدیل لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے تو وہ لفافہ اتار کر پھینک دیتا ہے پھر اپنا نور پھیلاتا ہے کہ جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی

(۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۴ء)

خواجہ الطاف حسین حالؔی انصاریوں کے معزز گھرانے میں قصبہ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فارسی اور عربی کی وطن ہی میں ہوئی۔ ابھی سترہ سال کی عمر تھی کہ شادی ہو گئی کچھ معاش کی الجھن کچھ شادی کی قید، تعلیم ادھوری رہ گئی اور وہ خاموشی سے دہلی چلے آئے۔ غدر سے پہلے دہلی میں علم و ادب کی بہار آئی ہوئی تھی، جدید تعلیم کے لئے دہلی کالج وجود میں آچکا تھا، حالی نے ایک معمولی سی ملازمت کرلی تاکہ دہلی میں رہ کر اپنے ادبی اور علمی ذوق کی تکمیل کر سکیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ انقلاب بپا ہوا اور انھیں پانی پت واپس آنا پڑا وطن پہونچ کر حالی پھر تحصیل علم میں لگ گئے۔ لیکن دہلی نے پھر کھینچا اور وہاں پہونچ کر حالؔی، مرزا غالبؔ کے شاگرد ہو گئے مزید برآں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے بھی تعلقات قائم ہو گئے۔ پھر حالؔی ۱۸۶۹ء تک انھیں کے ساتھ رہے۔ اس سال غالبؔ اور شیفتہ دونوں کا انتقال ہوا تو حالی دہلی سے نکلے اور لاہور گئے وہاں گورنمنٹ کے محکمہ تالیف و تصنیف میں ملازمت مل گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد کا ساتھ ہوا اور حالؔی نے انجمن پنجاب کے

لئے اپنی مشہور نظمیں برکھا رت، حب وطن، مناظرۂ رحم و انصاف لکھیں یہی زمانہ تھا کہ سر سید نے اپنی اصلاحی اور تعلیمی تحریک شروع کی تھی، رسالہ تہذیب الاخلاق نکالا تھا اور بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان اس نئی تحریک سے متاثر تھے۔ حالی بھی دہلی چلے آئے اور اینگلو عربک کالج میں ملازم ہو گئے سر سید سے تعلقات بڑھے اور وہ پوری طرح اس نئی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنا مشہور مسدس مد و جزر اسلام لکھا۔ یہاں سے حالی کی حیثیت ایک ادبی راہنما کی ہو جاتی ہے۔ سن ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء ہوئے۔ نظام حیدر آباد کے یہاں سے وظیفہ مقرر ہوا اور اپنا سارا وقت علمی کاموں میں صرف کرنے لگے۔

نثر میں حالی کی مشہور تصانیف مجالس النساء، حیات سعدی، یادگار غالب، مقدمہ شعر و شاعری، اور حیات جاوید ہیں۔ ان کے علاوہ مقالات اور مکتوبات حالی بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ حالی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے اور انھیں یقین تھا کہ اگر بدلتے ہوئے حالات میں ہمارا ادبی نقطۂ نظر نہ بدلا تو ہم بہت پیچھے چھوٹ جائیں گے اسی احساس نے ان کے قلم سے متعدد نثر کی صورتیں سوانح عمریاں، تنقیدی اور علمی مضامین لکھوائے تنقیدی

مقامات میں مقدمہ شعر و شاعری کو ایسی اہمیت حاصل ہوئی کہ دیوانِ حالی کا مقدمہ ہونے کے باوجود اُسے اصولِ شاعری کے متعلق ایک اہم تصنیف قرار دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی نے اردو میں پہلی دفعہ سلجھے، مدلل اور تنقیدی انداز میں فنِ شعر گوئی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی۔ سادہ لیکن خیال انگیز نثر میں تنقیدی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اس انتخاب میں مقدمہ شعر و شاعری ہی کے چند صفحے لئے گئے ہیں۔ مولانا حالی کے متعلق مزید معلومات کے لئے یادگارِ حالی (صالحہ عابد حسین)، حالی بہ حیثیت شاعر (شجاعت علی سندیلوی) حالی کا ذہنی ارتقا (غلام مصطفیٰ) دیکھنا چاہیئے۔

شعر کی تاثیر

شعر کی تاثیر کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ سامعین کو اکثر اس سے حزن یا نشاط یا جوش یا افسردگی کم یا زیادہ ضرور پیدا ہوتی ہے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس سے کچھ کام لیا جائے تو وہ کہاں تک فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ بھاپ سے جو حیرت انگیز کرشمے اب ظاہر ہوئے ہیں ان کا سراغ اوّل اس خفیف حرکت میں لگا تھا جو اکثر پکتی ہانڈی پر سینی کو بھاپ کے زور سے ہوا کرتی ہے

اس وقت کون جانتا تھا کہ اس ناچیز گیس میں جرار لشکروں، زخار دریاؤں کی طاقت چھپی ہوئی ہے۔

ناٹک

ہمارے ملک میں بھانڈ اور نقالوں کا کام بہت ذلیل سمجھا جاتا ہے اور ہولی میں جو سوانگ بھرے جاتے ہیں وہ سوسائٹی کے لئے مضر خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن یورپ میں انہی سوانگ اور نقالی نے اصلاح پاکر قوموں کو بے انتہا اخلاقی اور تمدنی فائدے پہنچائے ہیں۔

باجا

باجے کے تمام آلات جو ہمارے یہاں ہمیشہ لہو ولعب کے مجمعوں میں مستعمل ہوتے ہیں اور جن کو یہاں کے عقلا محض فضول جانتے ہیں۔ شائستہ قوموں نے ان کے مناسب استعمال سے نہایت گرانبہا فائدے اٹھائے ہیں۔ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ میدان جنگ میں جب اصول مقررہ کے موافق باجا بجتا ہے تو سپاہ کے دل حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ اور افسر کے حکم پر ہر سپاہی جان فدا کرنے کو موجود ہوجاتا ہے اور جب کسی وجہ سے جنگ کے موقع پر باجا بجنے سے رک جاتا ہے تو ان کے دل سرد ہوجاتے ہیں اور افسر کا حکم بہت کم مانا جاتا ہے۔

شعرا کا حسن قبول

تاریخ میں ایسی مثالیں بے شمار ملتی ہیں کہ شعرا نے اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں پر فتح نمایاں حاصل کی ہے۔ بعض اوقات شاعر کا کلام

جمہور کے دل پر ایسا تسلط کرتا ہے کہ شاعر کی ہر ایک چیز یہاں تک
کہ اس کے عیب بھی خلقت کی نظر میں مستحسن معلوم ہونے لگتے ہیں
اور لوگ اس بات میں کوشش کرتے ہیں کہ آپ بھی ان عیبوں
سے متصف ہو کر دکھائیں۔ بائرن کی نسبت مشہور ہے کہ لوگ اس
کی تصویر نہایت شوق سے خریدتے تھے اور اس کی نشانیاں اور
یادگاریں سینت سینت کر رکھتے تھے۔ اس کے اشعار حفظ یاد کرتے
تھے اور ویسے ہی اشعار کہنے کی کوشش کرتے تھے بلکہ یہ چاہتے تھے
کہ خود بھی ویسے ہی دکھائی دینے لگیں۔ اکثر لوگ آئینہ سامنے رکھ کر
مشق کیا کرتے تھے کہ اوپر کے ہونٹ اور پیشانی پر ویسی ہی شکن
ڈال لیں جیسی کہ لارڈ بائرن کی تصویر میں پائی جاتی ہے
بعضوں نے اس کی طرح گلے کا بند باندھنا چھوڑ دیا۔

پولیٹیکل معاملات میں شعر سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں

یورپ میں پولیٹیکل تحریکات کے وقت قدیم سے پوئٹری
مثال (۱) کو قوم کی حیثیت سے تحریک کا ایک زبردست آلہ سمجھتے
رہتے ہیں۔ ایک زمانہ میں ایتھنز والوں میں جزیرہ سلیمس کی بابت
مدت دراز تک جنگ رہی جس میں ایتھنز والوں کو برابر شکستیں
ہوتی رہیں اور رفتہ رفتہ ان کا حوصلہ ایسا پست ہوا کہ وہ ہمیشہ
کے لئے گرانی سے دست بردار ہو گئے اور اس بات پر اتفاق

کر لیا کہ جو شخص اس لڑائی کا ذکر کرے یا دوبارہ لڑنے کی تحریک کرے وہ قتل کیا جائے۔ اس وقت ایتھنز کا مشہور مقنن سولن زندہ تھا۔ اس کو نہایت غیرت آئی۔ اس نے اہل وطن کو پھر لڑائی کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ وہ دانستہ مجنوں بن گیا۔ جب ایتھنز میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ سولن دیوانہ ہو گیا ہے اس نے کچھ اشعار نہایت درد انگیز لکھے اور پرانے زردہ کپڑے پہن کر اور اپنے گلے میں ایک رسی اور سر پر پرانی چادر ڈال کر گھر سے نکلا۔ لوگ یہ حال دیکھ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ ایک بلندی پر جہاں اکثر فصحا منادی کیا کرتے تھے جا کھڑا ہوا اور اپنی عادت کے خلاف وہ اشعار پڑھنے شروع کئے جن کا مضمون یہ تھا۔ کاش میں ایتھنز میں پیدا نہ ہوتا بلکہ عجم یا بربر یا کسی اور ملک میں پیدا ہوتا جہاں کے باشندے میرے ہم وطنوں سے زیادہ جفاکش، سنگدل اور یونان کے علم و حکمت سے بے خبر ہوتے۔ وہ حالت میرے لئے اس سے بہتر تھی کہ لوگ مجھے دیکھ کر ایک دوسرے سے کہیں کہ یہ شخص بھی ایتھنز کا رہنے والا ہے جو سلیمس کی لڑائی سے بھاگ گئے۔ اے عزیزو! جلد دشمنوں سے انتقام لو اور یہ ننگ و عار ہم سے دور کرو۔ اور چین سے نہ بیٹھو جب تک کہ اپنا چھنا ہوا ملک ظالم دشمنوں کے پنجہ سے نہ چھڑا لو۔ ان عبرت انگیز اشعار سے ایتھنز والوں کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ اس وقت سب نے ہتھیار سنبھال کر سولن کو پانہ کا

سردار اور حاکم مقرر کیا اور سب کے سب ماہی گیروں کی کشتیوں میں سوار ہو کر سلمس پر چڑھ گئے آخر جیسا کہ تاریخ میں تفصیل مذکور ہے جزیرہ سلمس پر قابض ہو گئے اور دشمنوں میں سے بہت سے قید ہوئے اور باقی تمام مال و اسباب چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایک بار پھر علیم نے بڑے ساز و سامان کے ساتھ سلمس پر چڑھائی کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔

مثال (۲) انگلستان کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اڈورڈ نے جب ویلز پر چڑھائی کی تو ویلز کے شاعروں نے قومی ہمدردی کے جوش میں نہایت ولولہ انگیز اشعار کہنے شروع کئے تاکہ اہل ویلز کی ہمت اور غیرت زیادہ ہو اگرچہ انگلستان کی سپاہ کے آگے ان کی کچھ حقیقت نہ تھی لیکن شاعروں کے پرجوش کلام نے ان میں حب وطن کا جوش اس قدر پھیلا دیا تھا کہ جب وہ فوج شاہی کے مقابلہ میں کامیابی سے بالکل مایوس ہو گئے تو بھی اطاعت خوشی سے قبول نہ کی۔ شاعروں کے کلام سے اڈورڈ کی اس قدر مزاحمت ہوئی اور اس کو ایسی دقتیں اٹھانی پڑیں کہ فتح کے بعد اس نے ویلز کے تمام شاعروں اور مطربوں کو قتل کروا ڈالا۔ گو یہ شاعری کا نتیجہ ویلز کے شاعروں کے حق میں بہت برا ہوا اور ملک کے لئے بھی کچھ مفید نہ ہوا لیکن اس واقعہ سے شعر کی تاثیر اور کرامت بخوبی ثابت ہوتی ہے۔

مثال (۳) [illegible]

مشہور نظم ہے جس کے ایک حصّہ میں فرانس انگلستان اور روس کو غیرت دلائی ہے اور یونان کو ترکوں کی اطاعت سے آزاد کرانے پر برانگیختہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ جو فائدے یونان کے علم و حکمت سے یورپ نے اور خاص کر فرانس اور انگلستان نے حاصل کئے ہیں اس کا بدلہ آج تک یونان کو کچھ نہیں دیا گیا اور روس نے کبھی جو کہ گریک چرچ کی پیروی کا دم بھرتا ہے یونان کو کسی قسم کی مدد نہیں دی۔ پھر تینوں سلطنتوں کو غیرت دلانے کے لئے یونانیوں کو ترغیب دی ہے کہ غیروں سے کچھ امید نہ رکھنی چاہئے بلکہ خود اپنے دست و بازو پر بھروسہ کر کے ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونا چاہئے۔ ۱۸۱۲ء میں اس نظم کی اشاعت ہوئی جس کے سبب سے بائرن کی شاعری کی تمام یورپ میں دھوم مچ گئی اور انگریز اس کی نظم پر مفتوں ہو گئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ فرانس انگلستان اٹلی آسٹریا اور روس میں اس نظم سے وہ کام لیا گیا [illegible] پر کرتی ہے۔ جس وقت یونان نے ٹرکی سے بغاوت اختیار کی یورپ کا متفقہ بیڑا فوراً اس کی کمک کو پہنچا۔ ۱۸۲۷ء میں متفقہ بیڑے نے ترکوں کے بیڑے کو شکست دی اور ٹرکی کو یونان کے آزاد کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اور اس کی آزادی کو تمام یورپ نے تسلیم کر لیا۔ اوتھو ایک ڈنمارک کا شہزادہ یونان کا بادشاہ بنایا گیا اور یونان میں پارلیمنٹ قائم کی گئی۔

مثال (۴۴) سنہ ۱۸۳۰ء میں جب کہ چارلس دہم بادشاہ فرانس نے قانون کے برخلاف کارروائی کرنی شروع کی تو ہر طرف فرانس میں سخت اضطراب اور بے چینی پیدا ہوئی اس وقت فرانس [illegible] دو قصیدے ایک [illegible] اور دوسرا [illegible] مارسیلز لکھے گئے تھے جو گلی کوچوں اور شہروں میں جگہ جگہ گائے جاتے تھے اور جن میں لوگوں کو بادشاہ سے بغاوت اور آزادی کی حمایت کرنے پر اکسایا گیا۔

الغرض یورپ میں لوگوں نے شعر سے بڑے بڑے کام لئے ہیں [illegible] لوتھر نے یورپ کو جس قدر فائدہ پہنچایا ہے اس کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے اسی واسطے شیکسپیر کے ڈرامے [illegible] مشکل [illegible] اور [illegible] ہر طرح کے [illegible] بائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں بلکہ جو لوگ مذہب کی پابندی سے آزاد ہیں وہ ان کو بائبل سے بھی زیادہ سودمند اور فائدہ رساں خیال کرتے ہیں۔

ایشیا کی شاعری میں اگرچہ ایسی مثالیں جیسی کہ اوپر ذکر کی گئیں شاذ و نادر ملیں گی لیکن البتہ [illegible] واقعات [illegible] جن سے شعر کا غیر معمولی اثر [illegible] ظاہر ہوتا ہے۔

اعشیٰ کے کلام کی تاثیر عرب کا مشہور شاعر [illegible] جس کو [illegible] کے سبب [illegible]

کہتے تھے اس کے کلام میں یہ تاثیر ضرب المثل تھی کہ جس کی مدح
کرتا ہے وہ عزیز و نیک نام اور جس کی ہجو کرتا ہے وہ ذلیل و رسوا
ہو جاتا ہے۔ ایک بار ایک عورت اس کے پاس آئی اور یہ کہا کہ
میری لڑکیاں بہت ہیں اور کہیں ان کو بر نہیں ملتا، اگر تو چاہے تو
لوگوں کو شعر کے ذریعہ سے ہمارے خاندان کی طرف متوجہ
کر سکتا ہے۔ اعشیٰ نے اس کی لڑکیوں کے حسن و جمال اور خصائل
پسندیدہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جس کی بدولت ان لڑکیوں
کی صورت اور سیرت کا چرچا تمام ملک میں پھیل گیا اور چاروں طرف
سے ان کے پیغام آنے لگے یہاں تک کہ امرا نے بھاری بھاری
مہر مقرر کر کے ان سے شادیاں کر لیں۔ لڑکیوں کی ماں جب کوئی
لڑکی بیاہی جاتی تھی ایک اونٹ بطور شکریہ کے اعشیٰ کے واسطے
ہدیہ بھیج دیتی تھی۔

ایران کا ایک علاقہ

رودکی کے کلام کی تاثیر

ایران کے مشہور شاعر رودکی کا قصہ مشہور ہے کہ امیر نصر بن احمد
سامانی نے جب خراسان کو فتح کیا اور ہرات کی فرح بخش
آب و ہوا اس کو پسند آئی تو اس نے وہیں مقام کر دیا، اور بخارا
جو کہ سامانیوں کا اصلی تخت گاہ تھا اس کے دل سے فراموش
ہو گیا۔ لشکر کے سردار اور اعیان امرا جو بخارا میں عالیشان عمارتیں
اور عمدہ باغات رکھتے تھے ہرات میں رہتے رہتے اکتا گئے اور

اہل ہرات بھی سپاہ کے زیادہ ٹھہرنے سے گھبرا اٹھے۔ سب نے استاد ابوالحسن رودکی سے یہ درخواست کی کہ کسی طرح امیر کو بخارا کی طرف مراجعت کرنے کی ترغیب دے۔ رودکی نے ایک قصیدہ لکھا اور جس وقت بادشاہ راگ رنگ میں محو ہو رہا تھا، اس کے سامنے پڑھا۔ اس قصیدہ نے امیر کے دل پر ایسا اثر کیا کہ جھٹ جائی محفل چھوڑ کر اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر موزہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر مع لشکر کے بخارا کو روانہ ہو گیا اور دس کوس پر پہلی منزل کی۔

شاید اس قبیل کے واقعات ایشیائی شاعری میں کم دستیاب ہوں لیکن ایسی حکایتیں بے شمار ہیں کہ شعر کسی مناسب موقع پر پڑھا یا گایا گیا اور سامعین کے دل قابو سے باہر ہو گئے اور صحبت کا رنگ دگرگوں ہو گیا۔ اس موقع پر ایک حکایت نقل کی جاتی ہے

میر شیاعم کی رباعی کی تاثیر نور بائی گائن جس نے اپنے حسن و جمال، خوش آوازی، بذلہ سنجی اور مصاحبت کی عمدہ لیاقت کے سبب محمد شاہ کے تقرب کا درجہ حاصل کیا تھا اور جو تمام امرائے دربار کے دلوں پر قابض تھی، ایک روز نواب روشن الدولہ کے یہاں بیٹھی تھی اور ہنسی چہل کی باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں غالباً میر آل سید کھیک صاحب کی سواری جس سے نواب کو کمالِ عقیدت تھی پہنچی۔ نواب نے فوراً

بائی کو دوسرے کمرے میں بٹھا کر آگے سے چلمن چھوڑ وادی۔ میراں صاحب آئے اور اتفاق سے بہت دیر تک بیٹھے۔ بائی جو نہایت چلبلی اور بے چین طبیعت کی عورت تھی تنہائی میں زیادہ بیٹھنے کی تاب نہ لا کر بیباکانہ باہر نکل آئی۔ اور شیخ کی حضور میں جھک کر آداب بجا لائی اور عرض کی کہ لونڈی کو حکم ہو تو کچھ گائے۔ میراں صاحب چونکہ سماع کے عاشق تھے خاموش ہو رہے۔ بائی نے ان کی خاموشی کو اجازت سمجھ کر یہ رباعی نہایت سوز و گداز کی لے میں گانی شروع کی:۔

شیخے بہ زنے فاحشہ گفتا مستی
کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم
تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی؟

شیخ کی حالت اس برمحل رباعی کے سننے سے ایسی متغیر ہو گئی کہ بائی کو اپنی جسارت سے سخت نادم ہونا پڑا۔ باوجودیکہ نور بائی کو خاموش کر دیا گیا تھا شیخ کی شورش کسی طرح کم نہ ہوتی تھی وہ زمین پر مرغ بسمل کی طرح لوٹتے تھے اور دیواروں میں سر دے دے مارتے تھے دیر تک یہی حال رہا اور بہت مشکل سے ہوش میں آئے۔

شاعری ناشائستگی کے زمانہ میں ترقی پاتی ہے

بہر حال شعر اگر اصلیت سے بالکل متجاوز اور محض بے بنیاد باتوں پر مبنی نہ ہو تو تاثیر اور دلنشینی اس کی نیچر میں داخل ہے۔ لیکن شاعری کی نسبت جو رائیں زمانہ حال کے اکثر محققین نے قائم کی ہیں ان کا جھکاؤ اس طرف

پایا جاتا ہے سویلزیشن کا اثر شعر پر برا ہوتا ہے۔ جس قدر کہ علم زیادہ محقق ہوتا جاتا ہے اسی قدر تخیل جس پر شاعری کی بنیاد ہے گھٹتا جاتا ہے۔ اور کرید کی عادت جو ترقی علم کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے وہ شعر کے حق میں سم قاتل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک سوسائٹی نیم شائستہ اور اس کا علم اور واقفیت محدود رہتی ہے اور علل و اسباب پر اطلاع کم ہوتی ہے اس وقت تک زندگانی خود ایک کہانی معلوم ہوتی ہے زندگی کی سرگذشت جو کہ بالکل ایک واقعات کا سلسلہ ہوتا ہے اگر ایک نیم شائستہ سوسائٹی میں سیدھے سادے طور پر بھی بیان کی جائے تو اس سے کہیں خوف اور کہیں تعجب اور کہیں جوش خودبخود پیدا ہو جاتا ہے اور انہیں چیزوں پر شاعری کی بنیاد ہے۔ لیکن جب شائستگی زیادہ پھیلتی ہے تو یہ چشمے بند ہو جاتے ہیں اور اگر کہیں بند نہیں ہوتے تو ان کو نہایت احتیاط کے ساتھ روکا جاتا ہے تاکہ ان کا مضحکہ نہ اڑے۔

اس رائے کا ایک بڑا حامی یہ کہتا ہے کہ شعر دل پر ویسا ہی پردہ ڈالتا ہے جیسا کہ میجک لینٹرن آنکھ پر ڈالتی ہے۔ جس طرح اس لالٹین کا تماشا بالکل اندھیرے کمرے میں پورے کمال کو پہنچتا ہے اسی طرح شعر محض تاریک زمانہ میں اپنا پورا کرشمہ دکھاتا ہے اور جس طرح روشنی کے آتے ہی میجک لینٹرن کی تمام نمائشیں نابود ہو جاتی ہیں اسی طرح جوں جوں حقیقت کی حدود اربعہ صاف اور

روشن اور احتمالات کے پردے مرتفع ہوتے جاتے ہیں اسی قدر شاعری کے سیمیائی جلوے کافور ہوتے جاتے ہیں کیونکہ دو متناقض چیزیں یعنی حقیقت اور دھوکا جمع نہیں ہو سکتیں۔

فردوسی کی مثال

اس مطلب کے زیادہ دلنشیں ہونے کے لئے ذیل کی مثال پر غور کرنی چاہئے۔ فردوسی نے اپنے ہیرو رستم کی زورمندی اور بہادری کے متعلق جو کچھ شاہنامہ میں لکھا ہے ایک زمانہ وہ تھا کہ اس کو سنکر رستم کی غیر معمولی عظمت اور بڑائی کا یقین دل میں پیدا ہوتا تھا، اس کے زور اور شجاعت کا حال سن کر تعجب کیا جاتا تھا، سامعین کے دل میں خود بخود اس کے ساتھ ہمدردی اور اس کے حریفوں سے برخلافی کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اب جس قدر کہ علم بڑھتا جاتا ہے روز بروز وہ طلسم ٹوٹتا جاتا ہے اور وہ زمانہ قریب آتا ہے کہ رستم ایک معمولی آدمی سے زیادہ نہ سمجھا جائے گا۔

شاعری شائستگی میں قائم رہ سکتی ہے

اگرچہ یہ رائے جو شاعری کی نسبت اوپر بیان ہوئی کسی قدر صحیح ہے مگر اس کو ایسے ہی صحیح خیال کرنا نہیں چاہئے۔ جو لوگ اس رائے کے برخلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ علم کی ترقی سے الفاظ کے معنی محدود اور بہت سی باتوں کی واقفیت کے خیال خوب پختہ ہیں مگر زبانیں پہلے کی نسبت زیادہ پیچیدار اور اکثر مقاصد کے بیان کرنے

کے زیادہ لائق ہوتی جاتی ہیں۔ بہت سی تشبیہیں بالخصوص اس زمانہ میں
بیکار ہو گئی ہیں مگر ذہن نئی تشبیہیں اختراع کرنے سے عاجز نہیں ہوا۔
یہ سچ ہے کہ سائنس اور میکینکس جو پرانے خیالات کو فرسودہ کرنے والے ہیں
لیکن انھیں کی بدولت شاعر کے لئے نئی نئی تشبیہات اور تمثیلات
کا لازوال ذخیرہ جو پہلے موجود نہ تھا مہیا ہو گیا ہے اور ہوتا جاتا ہے۔
وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ سوسائٹی کے ترقی کرنے سے امیجنیشن
یعنی تخیل کی طاقت ضعیف ہو جاتی ہے بلکہ ان کا قول ہے کہ جب تک
بے شمار اسباب اور موانع جن کا اظہار نہیں ہو سکتا چاروں طرف سے ہم
کو گھیرے ہوئے ہیں، جب تک عشق انسان کے دل پر حکمران ہے اور ہر فرد بشر
کی روداد زندگی کو ایک عجیب قصہ بنا سکتا ہے، جب تک قوموں میں
حب وطن کا جوش موجود ہے، جب تک بنی نوع انسانی ہمدردی پر
متفق ہو کر شامل ہونے کے لئے تیار ہیں اور جب تک حادثات اور
واقعات جو زندگی میں اتفاقاً وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں خوشی یا غم کی
سلسلہ جنبانی کرتے ہیں تب تک اس بات کا خوف نہیں ہو سکتا کہ
تخیل کی طاقت کم ہو جائے گی، اور اس سے بھی کم خوف جب تک
نیچر کی کان کھلی ہوئی ہے اس بات کا ہے کہ شاعر کا ذخیرہ نبڑ جائے گا
ہاں مگر اس میں شک نہیں کہ نیچر کی جو نمایاں چیزیں تھیں وہ اگلے فردوں
نے چن لیں اور چونکہ ان کے لئے وہ پہلی تھیں اور اس لئے عجیب تھیں
اب ان کے تعجب انگیز بیان پر کوئی سبقت نہیں لے جا سکتا۔

پریم چند

۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۶ء

پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ مگر یہ وہ نواب رائے کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ کچھ مضامین اور افسانے انھوں نے ان ناموں سے بھی لکھے لیکن انھیں اصلی شہرت پریم چند ہی کے نام سے ہوئی۔ وہ شہر بنارس کے قریب پانڈے پور میں ایک متوسط درجے کے کایستھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی بڑی پریشانی میں گذری۔ تنگدستی، ناپسندیدہ شادی، سوتیلی ماں کا ساتھ، ذمہ داری کے احساس نے مل کر ان کی تعلیم کو نقصان لیکن زندگی کے تجربات کو فائدہ پہونچایا۔ ان تکالیف کے باوجود پریم چند نے ابتدا ہی سے اردو کے افسانوی ادب سے گہری دلچسپی لی۔ یہاں تک کہ سولہ سترہ سال کی عمر سے لکھنا شروع کر دیا۔ محکمۂ تعلیم میں ملازمت مل گئی تھی۔ اسی دوران میں پرائیویٹ انٹر میڈیٹ اور بی اے کے امتحان پاس کئے۔ جگہ جگہ تبادلہ ہوتے رہنے کی وجہ سے صحت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی لکھتے پڑھتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اس کا سبب قومی جدوجہد میں شریک ہونے کے شوق کے علاوہ یہ بھی تھا کہ سارا وقت لکھنے پڑھنے میں لگا سکیں۔ اس کے بعد کبھی تجارت کی، کبھی ملازمت، کبھی رسالوں اور اخباروں میں کام کیا۔ کبھی فلم میں کہانی لکھنے کا معاہدہ

کیا اور کبھی اپنا پریس چلانے کی کوشش کی۔ اس طرح خاصی تکلیف کے عالم اور خرابی صحت میں ۱۹۳۶ء میں بنارس میں انتقال کیا۔

ابتداء میں پریم چند نے کچھ مختصر ناول لکھے۔ ۱۹۰۷ء میں پہلا مختصر افسانہ دنیا کا سب سے انمول رتن لکھا۔ ۱۹۰۹ء میں افسانوں کا پہلا مجموعہ سوزِ وطن نواب رائے کے نام سے شائع کیا لیکن انگریزی حکومت نے اس کو ضبط کر کے جلا دیا۔ اس کے بعد سے وہ پریم چند کے نام سے لکھنے لگے کئی مجموعے جلد جلد شائع ہوئے لیکن اردو کے ساتھ ہندی دنیا میں بھی انھیں شہرت "سیوا سدن" "بازارِ حسن" لکھنے کے بعد حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۶ء تک پریم چند اردو میں لکھتے رہے اس کے بعد سے ان کی زیادہ توجہ ہندی کی طرف ہو گئی۔ پریم چند کی مشہور کتابیں یہ ہیں:-

پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی، واردات، زادِ راہ، آخری تحفہ، بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، بیوہ، چوگانِ ہستی، میدانِ عمل، اور گئو دان۔ انھوں نے بچوں کے لئے بھی کتابیں لکھیں، ترجمے بھی کیے، مضامین بھی لکھے اور ڈرامے بھی لیکن اُن کی اصلی شہرت افسانہ نگار اور ناول نویس کی حیثیت سے ہے کیونکہ ان تصانیف کے ذریعہ انھوں نے ہندوستان کے عوام اور دیہاتی سماج کو ادب کا جز بنا دیا۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں اس ہندوستان کی تصویر پیش کی جو جہالت، تعصب، غریبی، توہم، ذات پات کے اختلافات اور گھریلو جھگڑوں کا شکار ہونے کے باوجود بااخلاق، خوددار، مہمان نواز ہمدرد اور امن پسند تھا۔ اُن کا کہانی کہنے کا انداز بےحد دلکش، اور اُن کی

زبان بڑی پیاری تھی یہی وجہ ہے کہ ہندی اور اردو والے دونوں اُن کی ہر سطر کو عزیز رکھتے ہیں۔ پریم چند کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے پریم چند (ہنس راج رہبر) پریم چند کا تنقیدی مطالعہ (قمر رئیس) نیا افسانہ (وقار عظیم) "زمانہ" پریم چند نمبر (مرتبہ دیا نرائن نگم) دیکھئے۔

شطرنج کی بازی

نواب واجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ عیش و عشرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے امیر و غریب سب رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ کہیں نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں تو کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں رندی و مستی کا دور دورہ تھا۔ امور سیاست میں، شعر و سخن میں، طرزِ معاشرت میں، صنعت و حرفت میں، تجارت و تبادلہ میں سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔ اراکینِ سلطنت مے خواری کے غلام ہو رہے تھے۔ شعرا بوس و کنار میں مست، اہلِ حرفہ کلابتون اور چکن بنانے میں، اہلِ سیف تیتر بازی میں، اہلِ روزگار سرمہ و مسی عطر و تیل کی خرید و فروخت کے دلدادہ۔ غرض سارا ملک نفس پروری کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ساغر و جام کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، علم و حکمت کن کن ایجادوں میں مصروف ہے، بر و بحر پر مغربی اقوام کس طرح حاوی ہوتی جاتی ہیں، اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بٹیر لڑ رہے ہیں۔ تیتروں میں پالیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں چوسر ہو رہی ہے، پو بارہ کا شور مچا ہوا

ہے۔ کہیں شطرنج کے معرکے چھڑے ہوئے ہیں، فوجیں زیر و زبر ہو رہی ہیں۔ نواب کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ ہاں گتوں اور تالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔ حظ نفس کے لئے نئے نئے لٹکے، نئے نئے نسخے سوچے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فقرا خیرات کے پیسے پاتے تو روٹیاں خریدنے کی بجائے مدک چنڈو کے مزے لیتے تھے۔ رئیس زادے حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ارباب نشاط سے تلمذ کرتے تھے۔ فکر کو جولاں، عقل کو رسا، اور ذہن کو تیز کرنے کے لئے شطرنج کیمیا سمجھا جاتا تھا۔ اب بھی اس قوم کے لوگ کہیں کہیں موجود ہیں جو اس دلیل کو بڑے شد و مد سے پیش کرتے ہیں۔ اس لئے اگر مرزا سجاد علی اور میر روشن علی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عقل کو تیز کرنے میں صرف کیا کرتے تھے تو کسی ذی فہم کو اعتراض کرنے کا موقع نہ تھا۔ ہاں جہلا انھیں جو چاہیں سمجھیں۔ دونوں صاحبوں کے پاس موروثی جاگیریں تھیں۔ فکر معاش سے آزاد تھے۔ آخر اور کرتے ہی کیا۔ طلوع سحر ہوتے ہی دونوں صاحب ناشتہ کر کے بساط پر بیٹھ جاتے، مہرے بچھا لیتے اور عقل کو تیز کرنا شروع کر دیتے۔ پھر انھیں خبر نہ ہوتی تھی کہ کب دوپہر ہوا، کب سہ پہر اور کب شام۔ گھر سے بار بار آدمی آ کر کہتا تھا کھانا تیار ہے۔ یہاں سے جواب ملتا تھا چلو آتے ہیں، دسترخوان بچھاؤ۔ مگر شطرنج کے سامنے قورمے اور پلاؤ کے مزے بھی پھیکے تھے۔ یہاں تک کہ باورچی مجبور ہو کر کھانا کمرے میں ہی رکھ جاتا تھا اور دونوں دوست دونوں کام ساتھ ساتھ

کرکے اپنی باریک نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا رکھا
رہ جاتا، اس کی یاد ہی نہ آتی تھی۔ مرزا سجاد علی کے مکان میں
کوئی بڑا بوڑھا نہ آتا تھا، اس لئے انھیں کے دیوان خانے میں
معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کے
گھر کے اور لوگ اس مشغلہ سے خوش تھے۔ ہرگز نہیں۔ محلے کے لوگ،
گھر کے نوکر چاکروں میں، مہریوں، ماماؤں میں بڑی حاسدانہ [illegible]
[illegible] ہوتی رہتی تھیں۔ بڑا منحوس کھیل ہے۔ گھر کو تباہ کرکے چھوڑتا
ہے۔ خدا نہ کرے کسی کو اس کی چاٹ پڑے۔ آدمی نہ دین کے کام کا
رہتا ہے نہ دنیا کے کام کا۔ بس اسے دھوبی کا کتا سمجھو، گھر کا
نہ گھاٹ کا۔ بڑا مرض ہے۔ ستم یہ تھا کہ بیگم صاحبہ بھی آئے دن
اس مشغلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھیں۔ حالانکہ
انھیں اس کے موقعے مشکل سے ملتے۔ وہ سوتی ہی رہتی تھیں کہ ادھر
بازی جم جاتی تھی۔ رات کو سو جاتی تھیں تب کہیں مرزا جی گھر میں آتے
تھے۔ ہاں جولاہے کا غصہ داڑھی پر اتارا کرتی تھیں، نوکروں کو جھڑکیاں
دیا کرتیں۔ "کیا میاں نے پان مانگے ہیں؟ کہدے آکر لے جائیں۔" "کیا
پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے؟" "کیا کہا؟ ابھی کھانے کی فرصت نہیں
ہے؟ کھانا لے جاکر سر پر پٹک دو۔ کھائیں یا کتوں کو کھلائیں۔ یہاں
ان کے انتظار میں کون بیٹھا رہے گا۔" مگر لطف یہ تھا کہ انھیں اپنے
میاں سے اتنی شکایت نہ تھی جتنی میر صاحب سے۔ وہ میر صاحب

کو نلھٹو، بگاڑو، لگڑبگے خورو غیرہ ناموں سے یاد کیا کرتی تھیں۔ شاید مرزا جی بھی اپنی ہزیمت کے اظہار میں سارا الزام میر صاحب ہی کے سر ڈال دیتے تھے۔

ایک دن بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہونے لگا تو ماما سے کہا، "جا کر مرزا جی کو بلا لا۔ کسی حکیم کے یہاں سے دوا لادیں، دوڑ جلدی کر، سر پھٹا جاتا ہے۔" ماما گئی تو مرزا جی نے کہا "چل ابھی آتے ہیں"۔ بیگم صاحبہ کو اتنی تاب کہاں کہ ان کے سر میں درد ہو اور میاں شطرنج کھیلنے میں مصروف ہوں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور ماما سے کہا جا کر کہہ کہ "ابھی چلئے ورنہ وہ خود حکیم صاحب کے پاس چلی جائیں گی۔ کچھ ان کی آنکھوں راستہ نہیں دیکھا ہے۔" مرزا جی بڑی دلچسپ بازی کھیل رہے تھے۔ دو ہی کشتوں میں میر صاحب کی مات ہوئی جاتی تھی بولے "کیا ایسا دم لبوں پر ہے۔ ذرا صبر نہیں آتا۔ حکیم صاحب جیسے منتر کر دیں گے کہ ان کے آتے ہی آتے درد سر رفع ہو جائے گا۔"

میر صاحب نے فرمایا "ارے جا کر سن ہی آئیے نا! عورتیں نازک مزاج ہوتی ہیں۔"

مرزا جی:۔ ہاں کیوں نہ چلا جاؤں۔ دو کشتوں میں آپ کی مات ہوتی ہے۔

میر صاحب:۔ جی اس بھروسے نہ رہیئے گا۔ وہ چال سوچی ہے کہ آپ کے مہرے دھرے کے دھرے رہ جائیں اور مات۔

مر جائیے۔ پر جا کے سُن آئیے۔ کیوں خواہ مخواہ ذرا سی بات کے لیے ان کا دل دکھائیے گا۔

مرزا جی:- جی چاہتا ہے اسی بات پر مات کر دوں۔

میر صاحب:- میں کھیلوں گا ہی نہیں۔ آپ پہلے جا کر سُن آئیں۔

مرزا جی:- ارے یار جانا پڑے گا، حکیم کے یہاں، درد ورد خاک نہیں ہے۔ مجھے دق کرنے کا حیلہ ہے۔

میر صاحب:- کچھ بھی ہو ان کی خاطر تو کرنی پڑے گی۔

مرزا جی:- اچھا ایک چال اور چل لوں۔

میر صاحب:- ہرگز نہیں، جب تک آپ سن نہ آئیں گے، مہروں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ مرزا صاحب مجبور ہو کر اندر گئے تو بیگم صاحبہ نے کراہتے ہوئے کہا تمہیں نگوڑا شطرنج اتنا پیارا ہے کہ چاہے کوئی مر بھی جائے پر اٹھنے کا نام نہیں لیتے، شطرنج ہے کہ میری سوکن ہے، توبہ کوئی تم جیسا نرموہیا ہو۔

مرزا جی:- کیا کروں، میر صاحب مانتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکلوں سے گلا چھڑا کر آیا ہوں۔

بیگم:- کیا جیسے خود نکھٹو ہیں ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں۔ ان کے بھی تو بال بچے ہیں کہ سب کا صفایا کر دیا؟

مرزا:- بڑا لتی آدمی ہے۔ جب آ کے سر پہ سوار ہو جاتا ہے تو مجبور ہو کر مجھے بھی کھیلنا ہی [illegible]تا۔

بیگم:۔ دھتکار کیوں نہیں دیتے کتے کی طرح۔

مرزا:۔ سبحان اللہ برابر کے آدمی ہیں، عمر میں، رتبہ میں مجھ سے دو انگل اونچے۔ ملاحظہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

بیگم:۔ تو میں ہی دھتکارے دیتی ہوں۔ ناراض ہو جائیں گے۔ کون میری روٹیاں چلاتے ہیں۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی (ماما سے) عباسی! شطرنج اٹھا لا۔ میر صاحب سے کہہ دینا۔ میاں اب نہ کھیلیں گے۔ آپ تشریف لے جائیں۔ اب پھر منہ نہ دکھائیے گا۔

مرزا:۔ ہائیں ہائیں! ایسا غضب نہ کرنا۔ کیا ذلیل کراؤ گی۔ ٹھہر عباسی کمبخت کہاں دوڑی جاتی ہے۔

بیگم:۔ جانے کیوں نہیں دیتے۔ میرا ہی خون پیئے جو روکے۔ اچھا اسے روک لیا۔ مجھے روک لو تو جانوں۔ یہ کہہ کر بیگم صاحبہ خود جھلائی ہوئی دیوان خانہ کی طرف چلیں۔ مرزا جی کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بیوی سے منتیں کرنے لگے۔ خدا کے لئے تمہیں شہید کربلا کی قسم۔ میری ہی میت دیکھے جو ادھر قدم رکھے۔ لیکن بیگم صاحبہ نے ایک نہ مانی۔ دیوان خانہ کے دروازہ تک گئیں۔ یکایک نامحرم کے روبرو بے نقاب جاتے ہوئے پیر رک گئے۔ اندر کی طرف جھانکا۔ حسن اتفاق سے کمرہ خالی تھا۔ میر صاحب نے حسب ضرورت دو چار مہرے تبدیل کر دئے تھے اور اس

وقت اپنی صفائی جتانے کے لئے باہر چبوترہ پر چہل قدمی کر رہے تھے۔
بھر کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کو منہ مانگی مراد ملی۔ اندر جا کر بازی الٹ دی
مہرے کچھ تخت کے نیچے پھینکے۔ کچھ باہر۔ تب دروازہ اندر سے بند
کر کے کنڈی لگا دی۔ میر صاحب دروازہ پر تو تھے ہی۔ مہرے باہر
پھینکے جاتے دیکھے۔ پھر چوڑیوں کی جھنکار سنی تو سمجھ گئے بیگم صاحبہ
بگڑ گئیں، چپکے سے گھر کی راہ لی۔

مرزا نے بیگم صاحبہ سے کہا "تم نے غضب کر دیا"۔

بیگم:- اب موا ادھر آئے تو کھڑے کھڑے نکال دوں۔ گھر نہیں چکلہ
سمجھ لیا ہے۔ اتنی محبت اگر خدا سے ہوتی تو ولی ہو جاتے۔
آپ لوگ شطرنج کھیلیں۔ میں یہاں چولھے چکی میں سر کھپاؤں
لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ جانتے ہو حکیم صاحب کے یہاں نہ جانے
سے کس قدر بھی تامل ہے؟

مرزا جی گھر سے نکلے تو حکیم صاحب کے یہاں کے بدلے میر صاحب
کے گھر پہنچے۔ اور معذرت آمیز لہجہ میں سارا ماجرا کہہ سنایا۔
میر صاحب ہنس کر بولے۔ اتنا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا۔
جب ماما دردسر کا پیغام لائی تھی کہ آج آثار اچھے نہیں ہیں۔ مگر
بڑی غصہ ور معلوم ہوتی ہیں۔ اف! اتنی تمکنت آپ نے انھیں بہت
سر چڑھا رکھا ہے۔ یہ مناسب نہیں۔ انھیں اس سے کیا مطلب کہ
آپ باہر کیا کیا کرتے ہیں۔ خانہ داری کا انتظام کرنا ان کا کام ہے

مردوں کی باتوں میں دخل دینے کی انھیں کیا مجال! میرے یہاں دیکھئے
کبھی کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔

مرزا:- خیر اب یہ بتائیے، اب کہاں جماؤ ہوگا؟

میر:- اس کا کیا غم ہے، اتنا بڑا گھر پڑا ہوا ہے بس یہیں جمے گی۔

مرزا:- لیکن بیگم صاحبہ کو کیسے مناؤں گا؟ جب گھر پر بیٹھا رہتا تھا،
تب تو اتنی خفگی تھی، گھر سے چلا آؤں تو شاید زندہ نہ چھوڑیں۔

میر:- اجی بکنے دیجئے سو دو چار دن میں خود بخود سیدھی ہو جائیں گی۔
ہاں آپ بھی ذرا تن جائیے۔

(۲)

میر صاحب کی بیگم صاحبہ کسی وجہ سے میر صاحب کا گھر سے دور رہنا ہی پسند کرتی تھیں۔ اس لئے وہ ان کے مشغلہ تفریح کا مطلق گلہ نہ کرتی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی انھیں جانے میں دیر ہو جاتی یا کچھ الکسا جاتے تو سودہ بہ مستاں یاد دہانیدن کے مصداق انھیں آگاہ کر دیا کرتی تھیں۔ ان وجوہ سے میر صاحب کو گمان ہو گیا تھا کہ میری بیگم صاحبہ نہایت خلیق، متحمل مزاج اور عفت کیش ہیں۔ لیکن جب ان کے دیوان خانہ میں بساط بچھنے لگی اور میر صاحب کی دائمی موجودگی سے بیگم صاحبہ کی آزادی میں ہرج پیدا ہونے لگا تو انھیں بڑی تشویش دامنگیر ہوئی، دن کے دن دروازہ جھانکنے کو ترس جاتی تھیں سوچنے لگیں۔ کیونکر یہ بلا سر سے ٹلے۔

ادھر نوکروں میں بھی یہ کانا پھوسی ہونے لگی، اب تک دن بھر پڑے پڑے خراٹے لیتے تھے۔ گھر میں کوئی آئے کوئی جائے ان سے مطلب تھا نہ سروکار، بمشکل سے دو چار دفعہ بازار جانا پڑتا۔ اب آٹھوں پہر کی دھونس ہو گئی۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا، کبھی پانی لانے کا، کبھی برف لانے کا، کبھی تمباکو بھرنے کا، خفقہ تو کسی دل جلے عاشق کی طرح ہر دم گرم رہتا تھا۔ سب جا کر بیگم صاحبہ سے کہتے "حضور میاں کا شطرنج تو ہمارے جی کا جنجال ہو گیا۔ دن بھر دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صبح کو بیٹھے تو شام کر دی۔ گھڑی دو گھڑی کھیل لیا، چلو چھٹی ہوئی۔ اور پھر حضور تو جانتی ہیں کہ کتنا منحوس کھیل ہے، جسے اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے کبھی نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک کے پیچھے ایک محلے کے محلے تباہ ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ محلے والے ہر دم ہمیں لوگوں کو ٹوکا کرتے ہیں۔ شرم سے گڑ جانا پڑتا ہے۔" بیگم صاحبہ کہتیں "مجھے تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ پر کیا کروں میرا کیا بس ہے!"

محلے میں دو چار بڑے بوڑھے آدمی تھے وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ "اب خیریت نہیں۔ جب ہمارے رئیسوں کا یہ حال ہے تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے، یہ سلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہوگی، لچھن برے ہیں۔"

ملک میں واویلا مچا ہوا تھا، رعایا دن دہاڑے لٹتی تھی، پر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ دیہاتوں کی ساری دولت لکھنؤ میں کھنچی چلی آتی تھی اور یہاں سامانِ عیش کے بہم پہنچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ بھانڈ، نقال، کتھک، اربابِ نشاط کی گرم بازاری تھی، ان مفتوں کی دکانوں پر اشرفیاں برستی تھیں، رئیس زادے ایک ایک دم کی ایک ایک اشرفی پھینک دیتے تھے۔ مصارف کا یہ حال اور انگریزی کمپنی کا قرضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا، اس کی ادائیگی کی کسی کو فکر نہ تھی؟ یہاں تک کہ سالانہ خراج بھی ادا نہ ہو سکتا تھا۔ ریزیڈنٹ بار بار تاکیدی خطوط لکھتا، دھمکیاں دیتا؟ مگر یہاں لوگوں پر نفس پروری کا نشہ سوار تھا، کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔

میر صاحب کے دیوان خانے میں شطرنج ہوتے کئی مہینے گزر گئے۔ نت نئے نقشے حل کئے جاتے تھے، نئے نئے قلعے تعمیر ہوتے اور مسمار کئے جاتے۔ کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے آپس میں جھڑپ ہو جاتی، تو تو میں میں کی نوبت پہنچ جاتی، پر بہت جلد رنجش رفع ہو جاتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مرزا جی روٹھ کر اپنے گھر چلے جاتے، میر صاحب بساط اٹھا کر اپنے گھر میں آ بیٹھتے اور قسمیں کھاتے کہ اب کبھی شطرنج کے نزدیک نہ جائیں گے، مگر صبح ہوتے ہی دونوں دوست پھر آ بیٹھتے۔ نیند ساری بدمزگیوں کو دور کر دیتی تھی۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے شطرنج کے دلدل میں غوطے کھا رہے تھے کہ شاہی رسالہ کا ایک سوار وردی پہنے اسلحہ سے لیس میر صاحب کا نام پوچھتا آپہنچا۔ میر صاحب کے حواس اڑ گئے اوسان خطا ہو گئے، خدا جانے کیا بلا سر پر آئی۔ گھر کے دروازے بند کر لئے، اور نوکروں سے کہا، گھر میں نہیں ہیں۔

سوار نے پوچھا۔ گھر میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں۔ کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے۔

خدمتگار:- اچھا تشریف لے جائیے۔ کہہ دیا جائے گا۔

سوار:- کہنے سننے کی بات نہیں ہیں۔ کل پھر آؤں گا اور تلاش کر کے لے جاؤں گا، اپنے ہمراہ حاضر کرنے کا حکم ہوا ہے۔

سوار تو چلا گیا۔ میر صاحب کی روح فنا ہو گئی۔ کانپتے ہوئے مرزا جی بولے۔ اب کیا ہو گا؟

مرزا:- بڑی مصیبت ہے کہیں میری طلبی بھی نہ ہو۔

میر:- کمبخت کل پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔

مرزا:- قہر آسمانی ہے اور کیا۔ کہیں سپاہیوں کی مانگ ہوئی تو بن موت مرے، یہاں تو جنگ کا نام سنتے ہی تپ چڑھ آتی ہے۔

میر:- یہاں تو آج سے دانہ پانی حرام سمجھئے۔

مرزا:- بس یہی تدبیر ہے کہ اس سے ملئے ہی نہیں، دونوں آدمی غائب ہو جائیں، سارا شہر چھانتا پھرے۔ کل سے گومتی پار کسی ویرانے میں نقشہ جمے۔ وہاں کسے خبر ہو گی۔ حضرت آکر اپنا سا منہ لیکر

لوٹ جائیں گے۔

میر:۔ بس بس۔ آپ کو خوب سوجھی۔ واللہ کل سے گومتی پار کی ٹھہرے۔ ادھر بیگم صاحبہ سوار سے کہہ رہی تھیں "تم نے خوب بہروپ بھرا"۔ اس نے جواب دیا "ایسے گاؤدیوں کو تو چٹکیوں پر نچاتا ہوں۔ اس کی ساری عقل اور ہمت تو شطرنج نے چرلی، اب دیکھ لینا جو کبھی بھول کر بھی گھر رہے، صبح کو گیا پھر رات کو آئے گا۔

(۳)

اس دن سے دونوں دوست منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور بغل میں ایک چھوٹی سی دری دبائے، ڈبے میں گلوریاں بھرے، گومتی پار ایک پرانی ویران مسجد میں جا بیٹھتے جو شاید عہدِ مغلیہ کی یادگار تھی۔ راستہ میں چلم تمباکو مدریا لے لیتے اور مسجد میں پہنچ دری بچھا، حقہ بھر کر بساط پر جا بیٹھتے۔ پھر انھیں دین دنیا کی فکر نہ رہتی تھی "کشت، شہ، پیٹ لیا" ان الفاظ کے سوا ان کے منہ سے اور کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا۔ کوئی چلہ کش بھی اتنے استغراق کی حالت میں نہ بیٹھتا ہوگا۔ دوپہر کو جب بھوک معلوم ہوتی تو دونوں حضرت گلیوں میں ہوتے ہوئے کسی نانبائی کی دوکان پر کھانا کھا لیتے اور چلم حقہ پی کر پھر محوِ شطرنج بازی ہو جاتے۔ کبھی کبھی تو انھیں کھانے کی سدھ بھی نہ رہتی تھی۔

ادھر ملک میں سیاسی پیچیدگیاں روز بروز پیچیدہ تر ہوتی جاتی تھیں

کمپنی کی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھتی چلی آتی تھیں، شہر میں ہلچل مچا ہوا تھا لوگ اپنے بال بچوں کو لیکر دیہاتوں میں بھاگے جا رہے تھے، پر ہمارے دونوں شطرنج باز دوستوں کو غم دزد اور غم کالا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ گھر سے چلتے تو گلیوں میں ہو جاتے کہ کہیں سے کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ محلہ والوں کو بھی ان کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی، یہاں تک کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کے قریب پہنچ گئیں۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے۔ میر صاحب کی بازی کچھ کمزور تھی، مرزا صاحب انھیں کشت پر کشت دے رہے تھے کہ دفعتاً کمپنی کی فوج سڑک پر سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ کمپنی نے لکھنؤ پر تصرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قرض کی علت میں سلطنت ہضم کر لینا چاہتی تھی، وہی مہاجنی چال چلی جس سے آج ساری کمزور قومیں پا بہ زنجیر ہو رہی ہیں۔

میر صاحب:۔ انگریزی فوجیں آ رہی ہیں۔

مرزا:۔ آنے دیجئے۔ کشت بچائیے۔ یہ کشت۔

میر:۔ ذرا دیکھنا چاہئے۔ آڑ سے دیکھیں۔ کیسے قوی ہیکل جوان ہیں دیکھ کر سینہ تھراتا ہے۔

مرزا:۔ دیکھ لیجئے گا، کیا جلدی ہے۔ پھر کشت۔

میر:۔ توپ خانہ بھی ہے کوئی پانچ ہزار آدمی ہوں گے، سرخ چہرہ،

جیسے لال بندر۔

مرزا:۔ جناب حیلہ نہ کیجئے۔ یہ کشت۔

میر:۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خیال تو کیجئے۔ شہر کا محاصرہ ہو گیا تو گھر کیسے چلیں گے؟

مرزا:۔ جب گھر چلنے کا وقت آئے گا تو دیکھی جائے گی۔ یہ کشت اور مات!

فوج نکل گئی۔ یاروں نے دوسری بازی بچھا دی۔ مرزا جی بولے "آج کھانے کی کیسی رہے گی"؟

میر:۔ آج روزہ ہے۔ کیا آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے؟

مرزا:۔ جی نہیں۔ شہر میں نہ معلوم کیا ہو رہا ہو گا؟

میر:۔ شہر میں کچھ نہیں ہو رہا ہو گا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہوں گے، حضور، جان عالم بھی استراحت فرمانے ہوں گے۔ یا شاید ساغر کا دور چل رہا ہو۔

اب کے دونوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بج گئے۔ اب کے مرزا جی کی بازی کمزور تھی۔ اسی اثنا میں فوج کی واپسی کی آہٹ ملی۔ نواب واجد علی شاہ معزول کر دئے گئے تھے اور فوج انھیں گرفتار کئے لئے جاتی تھی۔ شہر میں کوئی ہنگامہ ہوا نہ کشت وخون، یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا۔ نواب گھر سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے لڑکی روتی پیٹتی سسرال جاتی ہے

بیگمیں روئیں۔ نواب زادے، ماما ئیں، مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ازل سے کسی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز، اتنی بے ضرر ہوئی ہوگی، کم از کم تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔ یہ وہ اہنسا نہ تھی جس پر ملائک خوش ہوتے ہیں۔ یہ وہ پست ہمتی، وہ نامردی تھی جس پر دیویاں روتی ہیں۔ لکھنؤ کا فرماں روا قیدی بنا چلا جاتا تھا اور لکھنؤ عیش کی نیند میں مست تھا۔ یہ سیاسی زوال کی انتہائی حد تھی۔

مرزا نے کہا، حضور عالی کو ظالموں نے قید کر لیا ہے۔

میر:۔ ہوگا۔ آپ کوئی قاضی ہیں۔ یہ لیجئے شہ۔

مرزا:۔ حضرت ذرا ٹھہریئے، اس وقت بازی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوتی، حضور عالی خون کے آنسو روتے جاتے ہوں گے، لکھنؤ کا چراغ آج گل ہو گیا۔

میر:۔ رویا ہی چاہئے۔ یہ عیش قید فرنگ میں کہاں میسر۔ یہ شہ!

مرزا:۔ کسی کے دن ہمیشہ برابر نہیں جاتے۔ کتنی سخت مصیبت ہے۔ بلائے آسمانی۔

میر:۔ ہاں ہے ہی۔ پھر کشت۔ بس دوسری کشت میں مات ہے بچ نہیں سکتے۔

مرزا:۔ آپ بڑے بے درد ہیں۔ واللہ ایسا حادثہ جانکاہ دیکھ کر آپ

کو صدمہ نہیں ہوتا۔ ہائے حضور جان عالم کے بعد اب کمال کا کوئی قدر دان نہ رہا۔ لکھنؤ ویران ہو گیا۔

میر: پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچائیے۔ پھر حضور پُر نور کا ماتم کیجئے گا، یہ کشت اور مات۔ ملا ناہاتھ۔

نواب کو لئے ہوئے فوج سامنے سے نکل گئی۔ ان کے جاتے ہی مرزاجی نے نئی بازی بچھا دی ہار کی چوٹ بُری ہوتی ہے۔ میر صاحب نے کہا۔ آئیے نواب صاحب کی حالت زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں لیکن مرزاجی کی وفاداری اور اطاعت شعاری اپنی ہار کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔ وہ کشت کا انتقام لینے کے لئے بے صبر ہو رہے تھے۔

(۴)

شام ہو گئی مسجد کے کھنڈر میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع کر دی۔ ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے چمٹ نماز مغرب ادا کرنے لگیں پر دونوں کھلاڑی بازی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ گویا وہ خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں مرزا متواتر تین بازیاں ہار چکے تھے۔ اب چوتھی بازی کا بھی رنگ اچھا نہ تھا۔ وہ بار بار جیتنے کا مستقل ارادہ کر کے خوب سنبھل سنبھل کر طبیعت پر زور دے دے کر کھیلتے تھے لیکن ایک نہ ایک چال ایسی خراب پڑ جاتی تھی کہ ساری بازی بگڑ جاتی، ادھر میر صاحب غزلیں پڑھتے تھے، ٹھمریاں گاتے تھے چٹکیاں لیتے، آوازے کستے تھے، ضلع اور جگت میں کمال دکھاتے

تھے، ایسے خوش تھے گویا کوئی دفینہ ہاتھ آگیا ہے۔ مرزا صاحب ان کی یہ خوش فعلیاں سُن سُن کر جھنجھلاتے تھے اور بار بار تیوری چڑھا کر کہتے "آپ چال نہ تبدیل کیا کیجیئے۔ یہ کیا، چال چلے اور فوراً بدل دی جو کچھ کرنا ہو ایک بار خوب غور کر کے کیجیئے۔ جناب، آپ مہرے پر انگلی کیوں رکھے رہتے ہیں۔ مہرے کو چھوڑ دیا کیجیئے۔ جب تک چال کا فیصلہ نہ ہو جائے مہرے کو ہاتھ نہ لگایا کیجیئے۔ حضرت آپ ایک چال آدھ آدھ گھنٹہ میں کیوں چلتے ہیں۔ اس کی سند نہیں، جس کی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگیں اس کی مات سمجھی جائے پھر آپ نے چال بدلی! مہرہ وہیں رکھ دیجیئے۔

میر صاحب کا فرزیں پٹا جاتا تھا۔ بولے میں نے چال چلی کب تھی۔

مرزا:- آپ کی چال ہو چکی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ مہرہ اسی گھر میں رکھ دیجیئے۔

میر:- اس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے مہرے کو ہاتھ سے چھوڑا کب تھا۔

مرزا:- آپ قیامت تک مہرے کو نہ چھوئیں تو کیا چال ہی نہ ہوگی۔

فرزیں پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔

میر:- دھاندلی آپ کرتے ہیں، ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے۔ دھاندلی کرنے سے کوئی نہیں جیتتا۔

مرزا:- یہ بازی آپ کی مات ہو گئی۔

میر:- میری مات کیوں ہو گئی۔

مرزا:۔ تو آپ مہرہ اس گھر میں رکھ دیجئے جہاں پہلے رکھا تھا۔

میر:۔ وہاں کیوں رکھوں، نہیں رکھتا۔

مرزا:۔ آپ کو رکھنا پڑے گا۔

میر:۔ ہرگز نہیں۔

مرزا:۔ رکھیں گے تو آپ کے فرشتے آپ کی حقیقت ہی کیا ہے

بات بڑھ گئی دونوں اپنی اپنی ٹیک کے دھنی تھے۔ نہ یہ دبتا تھا نہ وہ۔ تکرار میں لامحالہ غیر متعلق باتیں ہونے لگتی ہیں جن کا منشاء ذلیل اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔

مرزا جی نے فرمایا۔ اگر خاندان میں کسی نے شطرنج کھیلا ہوتا تو آپ آئین اور قاعدے سے واقف ہوتے۔ وہ ہمیشہ گھانس چھیلا کئے۔ آپ کیا کھا کر شطرنج کھیلئے گا۔ ریاست شئے دیگر ہے جاگیر مل جانے سے کوئی رئیس نہیں ہو جاتا۔

میر:۔ گھانس آپ کے ابا جان چھیلتے ہوں گے یہاں تو شطرنج کھیلتے پیڑھیاں اور پشتیں گذر گئیں۔

مرزا:۔ اجی جائیے۔ نواب غازی الدین کے یہاں باورچی گیری کرتے کرتے عمر گذر گئی، اس طفیل میں جاگیر پا گئے، آج رئیس بننے کا شوق چرایا ہے، رئیس بننا دل لگی نہیں۔

میر:۔ کیوں اپنے بزرگوں کے منہ میں کالکھ لگا رہے ہو۔ وہی باورچی رہے ہوں گے۔ ہمارے بزرگ تو نواب کے دسترخوان پر بیٹھتے

گردنیں کٹا دیں۔

اندھیرا ہوا تھا۔ بازی بچھی ہوئی تھی۔ دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر رونق افروز تھے۔ ان پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ گویا مقتولین کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کھنڈر کی بوسیدہ دیواریں اور خستہ حال کنگرے اور سبز جو دیوار ان لاشوں کو دیکھتے تھے اور انسانی زندگی کی بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے جس میں سنگ و خشت کا ثبات بھی نہیں۔

قتل کیے ہوئے — خاموشی — ویرانی — کانپ اٹھے — مینار — طوفانی — پتھر اور اینٹ

کے علمی کاموں کی رفتار میں تیزی پیدا کی۔ ہندوستان میں اردو ہندی جھگڑوں
کی وجہ سے جو فضا خراب ہو رہی تھی اس کی طرف مولوی عبدالحق نے
خاص توجہ کی اور اردو کا صور پوری طاقت سے پھونکا۔ اگرچہ اس کی وجہ
سے ان کی مخالفت میں بھی شدت پیدا ہو گئی لیکن وہ انتھک لگن کے
ساتھ اردو کی اشاعت میں مصروف رہے۔ اسی خدمت کا نتیجہ ہے کہ
انھیں زندگی ہی میں بابائے اردو کہا جانے لگا تھا۔

اردو کی اس خدمت میں ان کے علمی کاموں کا وزن بھی کم نہیں ہے۔
انھوں نے قدیم اردو، خاص کر دکنی اردو کے متعلق کافی مواد شائع
کیا، قدیم کتابیں تلاش کر کے ان پر مقدمے لکھے اور چھپوایا۔ "قواعد
اردو" کی طرف توجہ کی، لغات کی ترتیب کی فکر کی اور سب سے بڑا
کام یہ کیا کہ بہت سے لوگوں میں اردو کی خدمت اور تحقیق کا ذوق
پیدا کر دیا۔ وہ خود مولانا حالی کی سیرت اور ادبی خدمت سے
بہت متاثر ہوئے اور انھیں کے اسلوب کی پیروی کرتے رہے۔
عبدالحق کی زبان سادہ لیکن پُر اثر، انداز بیان دلکش ہوتا ہے۔
ان کی تصانیف میں سینکڑوں مضامین کے علاوہ حسب ذیل
کتابیں ترتیب، تالیف، تدوین اور تصنیف کے لحاظ سے اہم ہیں:
"مرحوم دہلی کالج"۔ "مرہٹی پر فارسی کا اثر"۔ "نصرتی"۔ "تنقید عبدالحق"
"مقدمات عبدالحق"۔ "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام"
"چند ہم عصر"۔ "سر سید احمد خاں"۔ "قواعد اردو"۔ "خطبات عبدالحق"

حال

جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے، یہ سنہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے
جب کہ غفران مآب اعلیٰ حضرت مرحوم کی جوبلی بلدہ حیدرآباد اور
تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے منائی جا رہی تھی۔
مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے
اور نظام کلب کے ایک حصہ میں ٹھہرائے گئے۔ زمانہ قیام میں اکثر
لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ایک روز
کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد
میں ایک معزز عہدہ پر فائز تھے مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار
تھے۔ زینے کے قریب اتر جاتے تھے سائیس کی جو شامت آئی تو
اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک
پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید
کر دیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے
اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا
سے مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں
دیکھ رہا تھا مولانا کا چہرہ متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے
اور کہتے تھے۔ ہائے ظالم نے کیا کیا۔ اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے
کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا فرماتے تھے
معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں اس کیفیت سے جو
کرب و درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بد نصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

تعظیم دے کر محجوب کرتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں۔ آیندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔

اس سے بڑھ کر خاکساری کا کیا ثبوت ہوگا کہ انھوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی اور حقیقی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ "مرتبہ" لکھا۔ کبھی مولفہ یا مصنفہ کا لفظ نہ لکھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مشہور سفیر مولوی انوار احمد مرحوم کہتے تھے کہ ایک بار وہ پانی پت گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے مولانا کے مکان پر پہنچے دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے پردہ اٹھایا اور جھانک کر دیکھا۔ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے تھے اور سامنے آگ کی انگیٹھی رکھی تھی انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اٹھ کر لے آئے اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ مزاج پرسی کے بعد کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد کھانا منگایا۔ انوار احمد مرحوم کھانے کے بہت شوقین تھے۔ پانی پت کی ملائی بہت مشہور ہے۔ ان کے لئے ملائی منگوائی کھانا کھانے کے بعد کچھ وقت بات چیت میں گذرا۔ پھر ان کے لئے پلنگ بچھوا کر بستر کرا دیا اور خود آرام کرنے کے لئے اندر چلے گئے۔ یہ بھی تھکے ہوئے تھے پڑ کر سو رہے۔ مولوی انوار احمد کہتے تھے کہ رات کے بارہ ایک بجے انھیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کی رزائی کو آہستہ سے چھو رہا ہے۔ انھوں نے چونک کر پوچھا کون؟

رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر میں تو کیا ہنسی کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقہ کی دل آزاری کا باعث ہو بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف انھیں لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

ہندی اردو کا جھگڑا ان کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا اور اس نے ناگوار صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن باوجود اس کے کہ انھوں نے عمر بھر اردو کی خدمت کی اور اپنی تحریروں سے اردو کا رتبہ بہت بلند کر دیا، وہ انصاف کی بات کہنے سے کبھی نہ چوکے۔

نام و نمود چھو کر نہیں گیا تھا ورنہ شہرت وہ بلا ہے کہ جہاں یہ آئی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے ہمارے شاعروں میں تعلّی عیب ہی نہیں رہی بلکہ شیوہ ہو گئی ہے وہ سیدھی سادی باتیں کرتے تھے اور جیسا کہ عام طور پر دستور ہے۔ باتوں باتوں میں شعر پڑھنا، بحث کر کے اپنی فضیلت جتانا یا اشارے کنائے میں دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی دکھانا ان میں بالکل نہ تھا البتہ شعر میں کہیں کہیں تعلّی آ گئی ہے مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا۔ مثلاً

گرچہ حالیؔ اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

یہ عذر کر دیتے تھے کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے اپنا لکھا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ محض عذر لنگ ہی نہ تھا اس میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ خود نمائی سے بہت بچتے تھے۔

جن دنوں مولانا حالیؔ کا قیام حیدر آباد میں تھا، ایک دن گرامی مرحوم نے چائے کی دعوت کی۔ چند اور احباب کو بھی بلایا۔ چائے وغیرہ کے بعد جیسا کہ معمول ہے فرمائش ہوئی کہ کچھ اپنا کلام سنائیے۔ مولانا نے وہی حافظے کا عذر کیا۔ ہر چند لوگوں نے کہا کچھ بھی جو یاد ہو فرمائیے۔ مگر مولانا عذر ہی کرتے رہے۔ اتنے میں ایک صاحب کو خوب سوجھی وہ چپکے سے اٹھے اور کہیں سے "دیوان حالیؔ" لے آئے اور لا کر سامنے رکھ دیا۔ اب مجبور ہوئے کوئی عذر نہ چل سکتا تھا آخر انھوں نے یہ غزل سنائی جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں، ان کا ذکر نہیں لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں ان میں سے بعض طرح طرح سے چشم و ابرو ہاتھ گردن اور جسم سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے، البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے تھے کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل

مضامین کے عنوان ہوں۔

انبر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

تو اس سے سمجھ لیجئے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہو گی۔ مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے، لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکلا۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہو گئیں اور وہی لوگ جو انھیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے ان کی تقلید کرنے لگے۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مخالفت سہنے کا ان میں عجیب و غریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ سہتے رہتے تھے، جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر غصہ آتا تھا لیکن ضبط سے کام لیتے تھے، ضبط اور اعتدال ان کے بہت بڑے اوصاف تھے اور یہ دو خوبیاں ان کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادیب کا بڑا کمال ہے۔ یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے ورنہ جوش میں آکر آدمی سررشتہ

موقوف کر دی اور جب تک اس لڑکے نے معافی نہیں مانگی ان سے صاف نہ ہوئے۔

مولانا نے دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی جس حالت میں تھے اس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی "قناعت" کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھیں عربک اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدرآباد میں ان کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو انھوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کئے۔ جس کے تخمیناً پچھتر خالی ہوتے ہیں ایک مدت تک پچھتر ہی ملتے رہے بعد میں پچیس کا اضافہ ہوا۔ ریاست حیدرآباد سے معمولی معمولی آدمیوں کو پنشن قرار وظیفے ملتے ہیں وہ چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر انھوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملنا تھا اس کے لئے وہ بہت شکر گذار تھے۔

غالباً سوائے ایک آدھ کے انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی جس نے چاہا چھاپ لی۔ ان کی تصانیف مال یغما تھیں۔ مسدس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو یہ کیسی سیر چشمی اور عالی ظرفی کی بات ہے خصوصاً ایسے شخص کے لئے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

مروت کے پتلے تھے۔ جب تک خاص مجبوری نہ ہوتی کسی کی درخواست رد نہیں کرتے تھے۔ وقت بے وقت لوگ آجاتے اور

سب سے پہلے مولانا نے مبارکباد کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خاں کی
کارگزاریوں سے خوش ہو کر ان کی تعریف میں نظم لکھی، ہمدردی اور
مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی۔ اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے
جو قابل اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے اور
اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کے خطوں میں بہت سے اشارے
پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصر اس بات سے بہت ناراض ہوتے
تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بہت فیاضی برتتے ہیں۔
جس سے لوگوں کا دماغ بگڑ جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن اس کا
دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذرا سی داد سے دل کتنا بڑھ جاتا اور
آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت ایک بری چیز ہے اور ہمیشہ سے
چلی آ رہی ہے۔ جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض
اوقات مجھے تجربہ کرا اور کرید کرید کر دیکھا ان کی تحریروں کے پڑھنے کا
اتفاق ہوا مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد
مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھتے ہیں اور جو باتیں
قابل تعریف تھیں ان کی دل کھول کر داد دی ہے مگر ان بزرگوں میں
سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آزاد مرحوم
تو ان کا نام سننے کے روادار نہ تھے۔ اس معاملے میں ان کی
طبیعت کا رنگ بجنسہ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں

صاحب موجود تھے۔ میں یہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ یوں بھی کچھ کہنا
خلافِ ادب تھا۔ لیکن جہاں بڑھنے سے پہلے اپنی رائے کا اظہار کر دیا
گیا ہو وہاں زبان سے کچھ نکالنا بے کار تھا۔

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سنیئے۔ قیامِ حیدرآباد
میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے
میں وہ دکن ریویو نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک
دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے
ان میں کسی قدر بیجا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے
متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں
نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر
جھکائے آنکھیں نیچی کئے چپ چاپ سنا کئے۔ مولانا نے یہ بھی
فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا۔ تنقید بہت اچھی چیز ہے اور
اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیونکر ہوگی لیکن
تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصبِ تنقید
کے خلاف ہے۔

خود مولانا پر بہت سی تنقیدیں لکھی گئیں اور نکتہ چینیاں کی
گئیں لیکن انھوں نے کبھی اس کا گلہ نہ کیا۔ مولانا حسرت موہانی
کا واقعہ جو [illegible] مرحوم نے بیان کیا اور اب [illegible]
اسمٰعیل صاحب نے [illegible] لکھا ہے [illegible]

لکھا" کہہ کر داد دیتے تھے۔ حالی بھی ہوں ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب نے مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کرکے بولے "ارے مولانا! یہ دیکھئے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے" اور پھر اس قسم کے الفاظ پڑھنے شروع کئے۔ "سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے۔"

مرحوم مولانا حالی ذرا بدمزہ نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا "حقیقی نکتہ چینی اصلاح زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب محل نہیں۔"

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ حالی کے خلاف وہ سب کچھ لکھ گئے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں سبھی کا ملال اب تک دل پر ہے۔

(رسالہ "زمانہ" ماہ ستمبر ۱۹۰۸ء جلد ۱۱ نمبر ۳ صفحہ ۲۶۸ تا ۲۷۶ (ماخوذ از تذکرہ حالی صفحہ ۱۹۵ تا ۱۹۸)۔

مولانا انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ وہ کبھی اس بات کو فراموش نہیں کر سکے لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے فلسفہ کو جس قدر سمجھتے تھے اس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں۔

ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور لبورتے رہتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا، اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اٹھتا تھا۔ مگر یہ بھی ہے وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے۔ خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان سے زمانہ حیدرآباد میں ایک روز "اودھ پنچ" آیا تو اسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے کہ اس میں سوائے مسخراپن کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انھیں علی گڑھ کے طلبہ سے اس سے اعلیٰ توقع تھی۔

ان کی بڑی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ نمونے کا کام دیں۔ یہ گفتگو انھوں نے کچھ اس ڈھنگ سے کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ خود کوئی ڈراما لکھیں۔ لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگزر کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے ان کے تعلقات میں فرق نہ آتا۔ جب ملتے تو اسی شفقت و عنایت سے پیش آتے اور کیا مجال کہ اس بدسلوکی یا بدمعاملگی کا ذکر زبان پر آنے پائے۔ اسی سے نہیں کسی دوسرے سے بھی کبھی ذکر نہ آتا۔ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص عذر کرتا جب ان سے ملتے تو ان کے حسن خلق اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ بڑے ذہین تھے۔ نکتہ چین جو دوسروں کی عیب گیری کے بغیر مانتے ہی نہیں، ان کے ڈانک یہاں آکر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں ورنہ یوں دنیا میں پند و نصائح کی کوئی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں کیسا ہی برا زمانہ کیوں نہ ہو دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی اب بھی بہت سے صاحب علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں!!

احمد شاہ بخاری پطرس

(۱۸۹۸ء تا ۱۹۵۹ء)

پطرس نے شاعری اگر کی بھی ہو تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے لیکن وہ اپنے نام کے بجائے تخلص ہی سے جانے جاتے ہیں۔ اُن کی تعلیم لاہور میں ہوئی اور وہیں وہ گورنمنٹ کالج میں ملازم ہو گئے۔ انگریزی زبان وادب سے ان کی واقفیت بہت سے اچھے انگریزی دانوں کے لئے بھی باعث رشک تھی۔ چنانچہ بہت دنوں تک وہ اسی کالج میں انگریزی کی تعلیم دیتے رہے۔ اس زمانہ میں پنجاب جدید ادبی تحریک کا گہوارہ بن رہا تھا۔ رسائل نکل رہے تھے اور بہت سے نوجوان ایسے یکجا ہو گئے تھے جنہیں اردو ادب کو سنوارنے، سربلند کرنے اور دوسری زبانوں کے ہم پلہ بنانے کی دُھن تھی۔ پطرس بھی انہیں میں تھے۔ انھوں نے مضامین لکھ کر، ترجمہ کر کے، ادبی مباحثوں میں شریک ہو کر، تقریریں کر کے اردو ادب میں مغربی انداز نظر پیدا کیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے جو مضامین لکھے وہ "مضامین پطرس" کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پطرس کو اسی ایک مجموعہ نے حیاتِ ابدی بخش دی ہے۔ کالج سے الگ ہو کر پطرس آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور ترقی کر کے اس کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہو گئے۔ تقسیم ہند کے وقت

وہ لاہور واپس چلے گئے اور پاکستان کے محکمۂ ریڈیو کے ڈائرکٹر بن گئے۔ کچھ دنوں بعد پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے یو۔این۔او میں گئے اور ادب سے تقریباً اُن کا رشتہ ختم ہو گیا ۱۹۵۸ء میں انھوں نے انتقال کیا۔

پطرس علمی لیاقت کے ساتھ ساتھ غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت بھی رکھتے تھے۔ ان کا فطری رجحان خوش طبعی، شگفتگی اور مزاح کی طرف تھا اس لئے ان کے وہ مضامین جن میں مزاح اور ظرافت کے عناصر پائے جاتے ہیں، اُن کے تنقیدی اور علمی مضامین کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین میں کہیں کوئی بات محض ہنسانے کے لئے پیدا نہیں کی گئی ہے اور نہ ایسے غیر فطری یا غیر متناسب پہلو پیدا کئے گئے ہیں جن سے ظرافت پیدا ہوتی ہو بلکہ یہ ہماری روز مرہ کی عام باتوں میں شگفتگی اور خوش طبعی کی وہ لہر دوڑاتے ہیں جو ہر جگہ نظر نہیں آتی اور جس میں ہمدردی ہے۔ ان کا ذریعہ فطرت انسانی کے گہرے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے جس کے سبب سے ہمارا لطیف پہلو نکل آتا ہے۔

پطرس نے بہت کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ اردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ ہے۔ اُن کے متعلق مزید معلومات کے لئے پڑھنا چاہیے۔ نقوش لاہور (پطرس نمبر)، نقوش لاہور (طنز و مزاح نمبر)، اردو ادب میں طنز و ظرافت (ڈاکٹر وزیر آغا)، اردو ادب میں طنز و مزاح (ظرافت)۔

Shaista

کتے

Shaista

کوشش کرنا

چیز الوالی کے دادا

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجیے، دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجیے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے! کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے "مطلع" عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا

ہونے ہیں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا لیکن ایسے موقعوں پر پتہ چلا کہ ان کی بھی کوئی نہیں سنتا اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے!

اور پھر ہم جیسے لوگوں کے ساتھ بھی کچھ عجیب عجیب واقعے ہوتے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے اس کا ذکر ہی جانے دیجئے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی۔ اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ راگ نہ سُر، نہ سر نہ پیر، تان پہ تان لگائے جاتے ہیں، بے تالے کہیں کے! نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔ گلے بازی کئے جاتے ہیں گھمنڈ اس بات

پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔
اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں لیکن ہم سے قسم لے لیجئے جو ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیہ گرہ سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو تعلی سمجھیں لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہئے کہ دافع بلیات ہے لیکن ہم کسی سے خوامخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے کہ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیتہ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی۔ اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔
بعض اوقات ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آرہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نو مشقی کا عالم بھی ہے اس لئے سیٹی پر اکتفا کی

ہے کہ بے سُرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا انگریزی موسیقی ہے۔ اُن میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو۔ آنکھوں نے اُسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی بڑا کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز سیٹی ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لئے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرع دعائیہ ہوتا کہ ”اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو“ لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے

بھونکنے وال

کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور بچوں بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک لے (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہیے) لیکن یہ کمبخت دو روزہ، سہ روزہ، دو دو تین تین تولے کے پلے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے باریک آواز، ذرا سا پھیپھڑا، اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ کر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیر لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے گا؟ بہرصورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک

ہمیشہ قابل نفریں رہی ہے۔ اگر ان کا نمایندہ شرافت کے ساتھ ہم سے
آکر کہہ دے کہ "عالی جناب! سڑک بند ہے" تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کیے
واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہم نے کتوں کی درخواست
پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ
و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔ (قارئین کرام کی خدمت
میں عرض ہے کہ اگر کوئی ان کا عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون
بلند آواز سے نہ پڑھا جائے مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں)۔
خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کیے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ
نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات
ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بار گناہ کا احساس
آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں
بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفرو
ں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا
گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ
آوازیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔
صورت حالات کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک
چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے
اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔
کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی

معمولی
چھچھوری چیزوں کے لئے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ جیسے سوکھے رات کے وقت بھی کتا اپنی خشک پتلی سی دم کو تا بحد امکاں سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا انھوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی "بچہ فقیروں کو چھیڑتا ہے نظر نہیں آتا۔ ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں؟" بس اس فقیر کی بد دعا سے اس وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لئے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے۔

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لئے باعث ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے" یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے تعلیم بدایوں، غازی پور آگرہ اور علی گڑھ میں حاصل کی۔ آگرہ سے بی۔ ایس سی پاس کرنے کے بعد ادبی ذوق ابھرا اور سائنس کی طرف جانے کے بجائے انگریزی میں ایم اے کرنے کے خیال سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۴ء میں ایم اے پاس کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد وہیں شعبۂ انگریزی میں لیکچرر ہو گئے ۱۹۳۶ء میں اردو میں بھی ایم اے کر کے شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئے ۱۹۴۲ء میں رضا کالج رامپور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹۴۵ء میں ریڈر ہو کر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں آگئے۔ وہاں تقریباً دس سال رہے پھر استعفا دے کر علی گڑھ میں گئے جہاں انھیں شعبۂ اردو میں بہ حیثیت پروفیسر مقرر کیا گیا۔ اس وقت وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ پانچ چھ سال سے انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری "اردو ادب" اور "ہماری زبان" کے ایڈیٹر بہت سے علمی اداروں سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساہتیہ اکیڈمی اردو ایڈوائزری بورڈ کے کنوینر بھی ہیں۔ ان کی اصلی شہرت کا میدان "تنقید نگاری اور شاعری کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

سرور کی ادبی نشو و نما طالب علمی ہی کے زمانہ سے شروع ہو گئی، ابتدا میں شاعری سے زیادہ دلچسپی تھی چنانچہ ۱۹۳۴ء میں ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ

سلسبیل شائع ہوا جس میں اکثر نظمیں کشمیر کے متعلق ہیں۔ یونیورسٹی میں پڑھنے پڑھانے کے سلسلہ میں تنقید ادب سے شغف بڑھا اور کچھ دنوں تک اس نے شاعری کے جذبہ کو دبائے رکھا۔ اس درمیان میں اُن کے مضامین کے مجموعے "تنقیدی اشارے"، "تنقید کیا ہے"، "نئے پرانے چراغ" اور "ادب اور نظریہ" شائع ہوئے۔ لکھنؤ کے دوران قیام میں شاعری کی دیوی نے پھر اپنا جادو چلایا، جس کا نتیجہ "ذوقِ جنون" ہے۔ کئی کتابوں کے مسودے ادھورے اور کئی مضامین کے مجموعے غیر مطبوعہ ہیں۔ سرور نے مرزا غالب کی کچھ غزلوں کا ترجمہ بھی انگریزی میں کیا ہے جو ابھی شائع نہیں ہوا۔

سائنس اور انگریزی ادب سے گہری دلچسپی رکھنے کی وجہ سے سرور کی تنقیدوں میں وسعتِ نظر اور گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی پرکھ منصفانہ اور ناقدانہ ہے لیکن اس سے اُن کا جمالیاتی ذوق مجروح نہیں ہوتا بلکہ اظہار میں کئی لطافت، ندرت اور تخلیقی رنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔ انھوں نے مغربی ادب کے نظریات کو فیشن کے طور پر قبول نہیں کیا ہے بلکہ اسے مشرقی ادب کے حسن کو پرکھنے کا ایک بہتر اور صحیح آلہ سمجھ کر اپنے خیالوں کا جز بنایا ہے۔ اُن کی تنقید تاریخی اور سماجی مؤثرات کو نظر انداز نہیں کرتی لیکن ادبی پہلوؤں پر زیادہ زور دیتی ہے۔ سرور کے متعلق مزید معلومات کے لئے دیکھئے۔
"اردو تنقید کا ارتقا" (ڈاکٹر عبادت بریلوی)، "نیرنگ نظر" (ابن فرید)
"اردو تنقید پر ایک نظر" (کلیم الدین احمد)

اردو نثر میں مزاح نگاری

کتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پٹنا پسند کرتے ہیں مگر یہ گوارا نہیں کرتے کہ کوئی اُن کے اوپر ہنسے۔ یہی حال انسانوں کا ہے، انھیں ضرب شدید پسند ہے (چاہے اس کا نتیجہ جنت ہو یا حوالات) مگر مضحکہ خیز بننا پسند نہیں۔ انسانوں کی اسی کمزوری سے مزاحیہ نگاری نے فائدہ اٹھایا ہے۔

نثر اردو میں مزاحیہ نگاری کا آغاز زرصل "اودھ پنچ" سے ہوتا ہے جو مشہور انگریزی اخبار "پنچ" کے نمونہ پر جاری کیا گیا تھا۔ مگر پنچ سے پہلے بھی ہمیں مزاحیہ نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ انیسویں صدی میں سب سے زبردست ادبی شخصیت غالب کی ہے ایک ہی وقت میں یہ بہت بڑا شاعر، بہت بڑا نثار، بہت بڑا ظریف اور بہت بڑا انسان تھا۔ ظرافت غالب کا جزو خمیر اور اسی بنا پر حالی نے انھیں "حیوانِ ظریف" کہا ہے۔ غالب کے خطوط میں ظرافت کی پاکیزہ اور ستھری مثالیں کثرت سے ملتی ہیں تعزیت ہو یا دوستوں کے کلام کی اصلاح، آپ بیتی ہو یا جگ بیتی، ادبی مسائل ہوں یا شاعرانہ شوخیاں، دنیا جہان روتی یا سوتی ہے غالب وہاں صرف مسکرا دیتے ہیں۔ جدت طرازی اور بات میں بات پیدا کرنا غالب کا کمال تھا۔ وہ صرف دوسروں پر ہی نہیں اپنے پر بھی ہنس سکتے تھے وہ قہقہے کے قائل نہیں، صرف زیرِ لب مسکراتے ہیں اس لحاظ سے وہ اردو کے ایڈیسن ہیں۔ ایڈیسن زندگی کو ایک تماشائی کی حیثیت سے

دیکھتا ہے۔ اس کا دلکش، رواں اور تبسم طراز انگریزی نثر کی معراج ہے غالب تماشائی نہیں خود تماشا ہیں۔ گہرے اور تیز چھینٹوں کے بجائے دونوں ہلکے ہلکے رنگوں کی آمیزش سے اپنی تصویر بناتے ہیں۔

غالب کے خطوط ۱۸۶۹ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے نذیر احمد کی "مراۃ العروس" بھی اسی سال چھپی نذیر احمد کی طرز میں بھی ظرافت پائی جاتی ہے یہ ظرافت بڑی بلیغ ہے اور ایک ایک جملے سے آدمی گھنٹوں مزے لے سکتا ہے مگر نذیر احمد مزاحیہ نگار نہیں۔ مزاحیہ نگاری ۱۸۷۷ء سے شروع ہوئی جب بقول ہمبلٹ کے "اودھ پنچ" نے زبان ہو ظرافت کے چہرے سے نقاب اٹھائی۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ آپ نے ۳۶ برس تک اس اخبار کے ذریعہ سے ادب اور انشا کے پھول کھلائے۔ ان کے رفیقوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد مولوی عبدالغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق، سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، مولوی احمد علی کسمنڈوی کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے اودھ پنچ کی اشاعت کے وقت کوئی ان لوگوں کو جانتا بھی نہ تھا۔ ان سب کی شہرت اودھ پنچ اخبار کے ذریعہ سے ہوئی۔ ان کی ظرافت منشی سجاد حسین کے اثر سے تھی۔ سجاد حسین کا ناول حاجی بغلول یا احمق الذی پڑھیے تو آپ کو پک وک پیپرس کا لطف آئے گا۔ گلیڈسٹن اور نظام حیدر آباد کے نام ان کے خطوط دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سیاسی مسائل میں ظرافت کی چاشنی کیسے پیدا کی جا سکتی ہے۔ لوکل علیہ الرحمۃ کے عنوان سے ان کے جو مضامین

نکلتے تھے ان میں موسم پر کچھ اس انداز سے تبصرہ ہوتا تھا کہ لوگ اگلے نمبر کے منتظر رہا کرتے تھے۔ سجاد حسین باغ و بہار آدمی تھے۔ انھوں نے "اودھ پنچ" کو اس زمانہ کا سب سے ہر دل عزیز پرچہ بنا دیا تھا۔ پنچ کی ظرافت کا میدان معاشرتی اور سیاسی تھا۔ معاشرتی نقطۂ نظر سے پنچ قدامت کا ہیرو اور سیاسی نقطۂ نظر سے جدیدیت کا حامی تھا۔ مادیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں "اودھ پنچ" نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی مگر اس کے ساتھ ساتھ آزادیٔ ہند کا حامی اور کانگریس کا طرفدار تھا۔ پنچ کی چھیڑ چھاڑ سے کم لوگ محفوظ رہتے ہوں گے۔ حالی۔ داغ۔ شرر اور سرشار کے خلاف "پنچ" نے کیا کچھ نہ لکھا۔ ان مضامین میں ادبی خوبی ہو یا نہ ہو ظرافت ضرور ہے۔ پنچ کے مضمون نگار خود ہنستے ہیں اور اپنی ہنسی سے دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ ان کی طنز میں تیزی ہے مگر زہرناکی نہیں۔ ان کی زبان لکھنؤ کی سلیس اور پاکیزہ زبان ہے یہ لوگ زندگی کی رنگینی و دلچسپی سے دل کھول کر لطف اٹھاتے ہیں شاید اسی لئے یہ دنیا میں آئے تھے۔ ہر محرم ان کے نزدیک میلہ تھا اور ہر موسم راگ و رنگ کا بہانہ۔ سجاد حسین کے علاوہ نواب سید محمد آزاد کا بھی ایک خاص طرز تھا۔ آپ نے لندن سے جو خطوط لکھے ہیں ان میں پرانی اور نئی روشنی کے فرق کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔

پنچ کے اس رنگ کو "فتنہ" اور "عطر فتنہ" نے قیامت کر دیا۔ ریاض کی شوخی اور چلبلی طبیعت نظموں اور غزلوں کے علاوہ نثر میں بھی اپنی بہار

دکھاتی ہے مگر یہاں بھی ظرافت کے معنی خوش طبعی کے ہیں۔ "تلخی و تیزی کے بجائے لطیف شیرینی ہے۔ "پنچ" جدید تہذیب کے علمبرداروں کو چھیڑتا ہے۔ مگر "فتنہ" کی دنیا حسن و عشق کی دنیا ہے۔ یہ حسینوں کو اس لئے چھیڑتے ہیں کہ ان کی گالیوں میں انھیں مزہ ملتا ہے۔

ادھر "پنچ" اور "فتنہ" کا دور ختم ہو رہا تھا۔ ادھر نئی تہذیب کے قدم رفتہ رفتہ جم رہے تھے۔ اور اس کی کوشش بار آور ہو رہی تھی۔ چنانچہ اب جن مزاحیہ نگاروں کے نام آتے ہیں وہ قدیم اور جدید کے درمیان کی کڑی ہیں اس دوسرے دور میں اگرچہ بہت سے آدمیوں نے مزاحیہ مضامین لکھے ہیں مگر مزاحیہ نگار صرف تین ہیں۔ سید محفوظ علی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں اور سلطان حیدر جوش۔ تینوں کا نقطۂ نظر ایک ہے۔ تینوں علی گڑھ کے پرانے گنہ گار، قدامت کے پرستار اور جدیدیت کے دشمن ہیں مگر تینوں کا مشاہدہ چونکہ تیز ہے اس لئے جہاں کہیں افراط و تفریط یا نشیب و فراز ملتے ہیں ان کے مضحکہ خیز پہلو دکھانے سے نہیں چوکتے۔ سید محفوظ علی کا نام بہت کم لوگ جانتے ہیں آپ نے اپنے نام سے کبھی کوئی مضمون نہیں لکھا۔ بلکہ بیشتر انداز قدر سے پہچانے گئے۔ ہمدرد میں "تجاہل عارفانہ" کے نام سے "نقیب" میں ملّا بدھالوئی کے نام سے علی گڑھ میگزین میں "شمع بے نور" کے نام سے آپ کے مضامین نکلے ہیں۔ نظامی پریس نے ایک مختصر مجموعہ "انتخاب نقیب" کے نام سے آپ کے چند مضامین کا شائع ہوا ہے۔ ان مضامین کا ادبی پایہ بہت بلند ہے۔ شیخ سماء اللہ خاں کی صاحبزادیاں یا صاحب ذوق ظرافت

کے بلند ترین نصب العین پر پورے اترتے ہیں انھیں پڑھ کر کوئی قہقہہ نہیں لگاتا بلکہ ہنستا بھی نہیں، مگر ان میں وہ تازگی، شگفتگی اور نفاست ہے کہ روح میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اوّل تو مضامین کا عالمانہ اور جچا تلا انداز بیان دوسرے مصنف کی اپنے آپ کو ستر پردوں میں رکھنے کی کوشش یہی وجہ ہے کہ لوگ ان مضامین سے زیادہ واقف نہیں۔

ظفر علی خاں اور سید محفوظ علی ایک ہی زمانے کے ہیں۔ دونوں نے ساتھ پڑھا ہے اور برسوں ساتھ رہے ہیں مگر دونوں میں نقطۂ نظر ایک ہونے کے باوجود بڑا فرق ہے۔ محفوظ علی مزاح نگار ہیں، ظفر علی خاں طنز نگار اور آپ جانتے ہیں طنز و ظرافت ایک دوسرے سے کتنے قریب ہونے پر بھی کتنے دور ہیں ظفر علی خاں اچھے شاعر، اچھے نثر نگار، اچھے مقرر، اس وجہ سے ہیں کہ وہ اچھے جرنلسٹ ہیں یہی ان کی سب سے بڑی خوبی اور یہی ان کی سب سے بڑی خامی ہے۔ وہ شعر پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ہمالیہ کے چشمے ابل رہے ہیں۔ تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے نعرہ جہاد ہے جو دلوں میں گھسا جا رہا ہے اور لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک تلوار ہے جو دائیں بائیں دونوں طرف ستھراؤ کرتی جا رہی ہے وہ بہت جلد لکھتے ہیں اور بڑا اچھا لکھتے ہیں۔ اپنے فنی شعور تک پہنچنے اور اپنے طنز کو پختہ کرنے کے لئے انھیں بہت ریاض نہیں کرنا پڑا۔ مگر چونکہ وہ جرنلسٹ ہیں اس لئے ان کی تحریروں میں ابدیت نہیں سیاست کی دنیا میں قدروں کا احساس باقی نہیں رہتا۔ آج ایک چھوٹے سے فائدے کے لئے کل کا بڑا نقصان گوارا کر لینا سیاسی آدمی سے بعید نہیں ظفر علی خاں

کی ساری زندگی وار کرنے اور وار سہنے میں گذری ہے، اس کی وجہ سے ان کی شخصیت دلچسپ ہو گئی ہے مگر اس لڑائی اور ان ہتھیاروں سے آنے والی نسلوں کو بھی دلچسپی ہو سکتی ہے، یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔

سلطان حیدر جوش کا میدان دوسرا ہے یہ علی گڑھ کے پرانے طلبہ اور جیل مرکب کے پیرو ہیں۔ علی گڑھ کی اقامتی زندگی ایک زمانہ میں بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ نہ معلوم کیوں اس نے جیل مرکب کا نام اختیار کیا۔ اس کا سب سے اچھا نمونہ ولایت علی بمبوق کے مشہور مضمون "ڈیوا دی" میں ملتا ہے۔ بہر حال شوخی، شرارت، مذاق کے ساتھ ساتھ فلسفہ کا امتزاج سلطان حیدر جوش کے مضامین اور افسانوں میں جھلکتا ہے۔

مزاحیہ نگاری کا تیسرا دور جنگ عظیم کے بعد سے شروع ہوتا ہے اس میں سر فہرست فرحت اللہ بیگ پطرس اور رشید احمد صدیقی ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کے مضامین پانچ حصوں میں شائع ہو چکے ہیں، ان کی شہرت کا دارو مدار "نذیر احمد کی کہانی" "ایک وصیت کی تعمیل" اور "پھول والوں کی سیر" پر ہے۔ ان کی ظرافت زبان کی چاشنی اور انداز بیان کی سادگی سے بنی ہے۔ "نذیر احمد کی کہانی" قطعی غیر فانی چیز ہے اس کے پڑھنے سے جہاں نذیر احمد کی شخصیت اور عظمت کا احساس ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک انسان کی تصویر ہے اور ایک ایسے مصور نے بنائی ہے جو رنگوں کی آمیزش میں مہارت رکھتا ہے کچھ ہمدردی، کچھ خلوص اور کچھ تعصب اہلیت، یہ تینوں چیزیں اگر جمع ہو جائیں تو مشاہیر کی عکسی تصویریں بڑی کامیاب ہو سکتی ہیں۔ نذیر احمد کی کہانی میں

یہ سب کچھ موجود ہے۔ "وصیت کی تعمیل" وحیدالدین سلیم کی قلمی تصویر ہے ہو اس میں وہی بات ہے جو "نذیر احمد کی کہانی" میں یعنی یہاں بھی مصنف ان دونوں شخصوں کی عظمت سے متاثر ہے مگر ان سے مرعوب نہیں۔ ان کی مضامین کی کامیابی کا یہی راز ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کے طرز پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں محاوروں کی بھرمار ہے۔ یہ اعتراض مرزا فرحت اللہ پر بھی وارد ہو سکتا ہے۔

فرحت اللہ سرتاسر مشرقی ہیں اور پطرس سرتاسر مغربی، فرحت کی ظرافت زبان کے لطف سے پیدا ہوتی ہے پطرس کا خیال مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ شاعر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ابھی بہار دور ہوتی ہے کہ اس کے دل میں جنون عشق کے آثار ملنے لگتے ہیں مگر اچھا طنز نگار ہر معمولی اور پیش پا افتادہ چیز میں بھی کوئی مضحکہ خیز پہلو دیکھ لیتا ہے پطرس کی ظرافت کا کمال یہی ہے انھوں نے مغربی ادب کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ قدامت کے پجاریوں یا نئی تہذیب کے پرستاروں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ اس قسم کی تنقید کی عمر زیادہ نہیں ہوتی وہ ایسی چیزیں لیتے ہیں جو ہر وقت اور ہر موقع پر دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں "مضامین پطرس" اٹھائیے پہلا جملہ یہ ہے "اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرایا ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔" دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ ان جملوں کا لکھنے والا خود نہیں ہنستا مگر آپ مسکرائے بغیر نہیں

رہ سکتے اس لئے کہ یہاں آپ کو ذہانت، طباعی، بیر مشاہدہ، تخیل سب کی کارفرمائی عجیب انداز سے ملتی ہے۔ پطرس نے بہت کم مضامین لکھے ہیں مگر پھر بھی وہ ہمارے جونی کے ظرافت نگاری میں ہیں۔ اتنا تھوڑا سرمایہ لیکر بقائے دوام کے دربار میں کم لوگ داخل ہوئے ہوں گے۔ "کتے" "دیسیجے" اور "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" یا "سینکل" "لاہور کا جغرافیہ" یہ مضامین زندہ رہنے والے ہیں خصوصاً "کتے" والے مضمون کا جس قدر تتبع کیا گیا ہے وہ اس کی کامیابی کا خود ثبوت ہے۔

رشید احمد صدیقی، پطرس اور فرحت اللہ بیگ دونوں سے مختلف ہیں یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو قدامت پسند یا جدیدیت پسند نہیں کہہ سکتے۔ ان کا ایک قدم یہاں ہے۔ اور ایک وہاں ہے۔ PARADOX اور REPARTEE دونوں کے ماہر ہیں۔ اس لحاظ سے اردو کے چسٹرٹن بھی ہیں اور برنارڈ شا بھی۔ پطرس اپنی ظرافت کے لئے خام مواد زندوں سے لیتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ مردوں سے اور رشید احمد صدیقی شعر و ادب سے۔ یہ یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں اور ان کے مضامین میں علی گڑھ کی اقامتی زندگی کا عکس جابجا ملتا ہے چنانچہ مقامی رنگ کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی اس قدر ہوتی ہے کہ رشید صدیقی کے مضامین سے صرف خواص ہی لطف لے سکتے ہیں۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ کتابی صورت میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہو چکا ہے اور ریڈیو والی تقریریں شائع ہونے والی ہیں۔ رشید صدیقی کے یہاں ظرافت کی جان طنز ہے وہ اکبر کے پیرو ہیں اور ان سے آزاد بھی جس طرح اکبر کے یہاں بعض مخصوص علامات ہیں، اسی طرح رشید صدیقی آئی سی۔ ایس روشن خیال بیوی، مرشد،

حاجی بلغ العلیٰ، بلبل، ارہر کا کھیت سے خاص کام لیتے ہیں۔ وہ جذبات پیش نہیں کرتے۔ چند گہرے اور شوخ رنگوں سے اپنی تصویر بناتے ہیں۔ بادل اٹھنے کی کیفیت دکھانا چاہتے ہیں تو زلفِ شب سے مدد نہیں لیتے بلکہ انگریزوں کے ٹریڈ مارٹ یا چمارن کی جدائی کا واسطہ دلاتے ہیں۔ جدید نسل کی ذہنی زندگی دیکھنا ہے تو رشید صدیقی کے مضامین پڑھئے۔ یہاں آپ کو مغربی تہذیب، مغربی تعلیم دورِ حاضر کے اہم واقعات، شعر و ادب کے نئے انکشافات، تعلیم یافتہ طبقہ کے مشاغل، سائنس کے نظریے، آزاد خیالی کے کرشمے سب کی رنگا رنگی ملے گی۔ ارہر کے کھیت اور پارلیمنٹ کو ایک صف میں لا کھڑا کرنا اور شاعر، فلسفی اور مولوی کی گمراہیوں کو ایک نظر میں دیکھ لینا رشید صدیقی کا کمال ہے۔

جس طرح انگریزی ادب میں سوئفٹ کے یہاں طنز یا تیکھا رخ سب سے زیادہ نمایاں ہے اسی طرح اردو میں اکبر اور رشید صدیقی اس لحاظ سے ممتاز ہیں۔ دونوں نے خون خرابے والی چیزیں لکھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان پر خون خرابہ نہ ہوا ہو۔

چغتائی، شوکت، رموزی اور ایم اسلم اس زمانہ کے کامیاب مزاحیہ نگاروں میں ہیں ان سب کے مضامین اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ چغتائی واقعات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں، شوکت زبان کی چاشنی سے فضا تیار کرتے ہیں۔ رموزی کی سوجھ بوجھ اچھی ہے، اسلم صرف ہنسوڑ ہیں۔ چغتائی کے افسانوں کو پڑھ کر مشہور انگریزی مصنف پی۔ جی۔ ووڈ ہاؤس کی یاد آتی ہے۔ دونوں کی ذہانت اور طباعی میں کلام نہیں مگر دونوں کی بسیار نویسی ان کے حق میں کانٹے بوتی

ہے۔ شوکت بھی اسی مرض میں گرفتار ہیں۔ صحافتی زندگی ان کی طبعی شگفتگی سے ہم آہنگ رہی ہے۔ "چغتائی کا کولتار"، "شریر بیوی" اور "الشذری" نہایت دلچسپ ہیں۔ شوکت نے "سودیشی ریل" بہت اچھی لکھی ہے۔ ملا رموزی، شوکت اور عظیم بیگ تینوں کے یہاں ایک بہت بڑی کمی ہے۔ تینوں اپنا یا اپنے گھر والوں کا اس طرح پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ طبیعت الجھنے لگتی ہے۔ یہ چیز چغتائی کے یہاں نسبتاً کم اور رموزی کے یہاں سب سے زیادہ ہے۔ رموزی کے یہاں سوجھ بوجھ بھی ہے مگر تقلید زیادہ ہے۔ ان کی غلابات وہی ہیں جن کو بہت عرصہ ہوا سب سنتے چلے آتے تھے۔ وہ یا پیرا خبار کو اب بھی جدید نسل کا صحیفہ الٰہی سمجھتے ہیں حالانکہ نہ وہ اخبار ہے نہ وہ جدید نسل ہے۔ وہ جہاں ہنسانا رنگ اختیار کرتے ہیں اور روتے ہیں تو ان پر ہنسی آنے لگتی ہے اور ان کی ہنسی پر رونا آتا ہے۔

ان اشخاص کے علاوہ کچھ لوگ اور بھی ہیں جن کا اس سلسلہ میں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ مزاحیہ نگار تو نہیں ہیں مگر انھوں نے بعض بڑی پر لطف چیزیں لکھی ہیں۔ مولانا محمد علی کے مضامین میں جا بجا ظرافت کے چھینٹے ملتے ہیں۔ حسن نظامی کی چٹکیاں اور گدگدیاں بھی مزے کی ہیں، مگر امتیاز علی تاج کی کتاب "چچا چھکن" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ تاج کا ہیرو "جیروم" کے ہیرو "جیروم کے کردار" کا ایک عکس ہے، مگر تاج نے اس میں یہاں کی فضا اور ماحول پیش کر کے اسے بالکل مشرقی بنا دیا ہے۔ اس عنوان پر بہت سے مضامین لکھے گئے مگر مولوی مدن کی بات کہیں نظر نہ آئی۔ دوسری اہم کتاب "مضامین فلک پیما" ہے۔ اس میں

مذہب، تہذیب، تمدن، معاشرت، شعر و ادب پر نہایت بے باک تنقید بن ہے
کوئی مشاق سرجن بھی اس طرح نشتر نہ چلاتا ہوگا جس طرح "فلک پیما" سوسائٹی
کے فاسد مادہ پر نشتر زنی کرتے ہیں۔ یہ حسن کے بڑے ادا شناس ہیں اور ان کے
انداز میں بڑا بانکپن اور گہرائی ہے۔ حال ہی میں کنہیا لال کپور نے طنز میں خاصا
نام پیدا کیا ہے۔ ان کے دوستوں نے انھیں کچھ سے تشبیہ دی ہے۔ "غالب
ترقی پسند شعرا کی محفل میں" ان کی کامیاب پیروڈی ہے۔ ان کے علاوہ اخبار
میں سہرا ہے، وکالات، افکار و حوادث، نظر سے خوش گذرے بہت سے
عنوانات مزاحیہ نگاری کی مقبولیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ غرض اس دور میں
جہاں ایک طرف تخلیقی قوتیں نمودار ہو رہی ہیں، وہاں نقالی، فریب اور جعل
بھی بہت ہے اور ان ہی کی افراط سے مزاحیہ نگار اپنے لئے خام مواد حاصل
کرتا ہے وہ شاعر یا ناصح سے کم نہیں بلکہ ایک منزل وہ آتی ہے جہاں نصیحت
یا شاعری بیکار ہوتی ہے اس وقت مزاحیہ نگار طنز و ظرافت کے پردے میں
زندگی کو سدھارتا ہے اور سنوارتا ہے۔ اس کی تلخیوں اور مایوسیوں کو گوارا
بناتا ہے اور اس میں وزن، وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے۔ اکبر کے متعلق
اقبال کا یہ قطعہ مزاحیہ نگار کے نصب العین کو کتنی اچھی طرح واضح کرتا ہے۔

سرو زدہ طور معنے کلیمے ... یہ بت خانہ دور حافظ خلیلے
گہے گریۂ او چو ابر بہارے ... گہے خندۂ او چو تیغ اصیلے

(۱۹۳۹)



ASL-278 — Maths fifth Primery 5th [illegible]
(in Urdu) 1953 — 190 pages.

HSL-279 — Elements of Calculus
Sodi-chand, SP Arora, HL Sufoté
universal Publishing Company Delhi 1956
222 pages

ASL-280 Urdu Course [illegible] ([illegible])
Prof. Syed Ihtisham Husain Allahabad
J&K university (1968) — 208 pages

ASL-281 Qawaid-i- farsi [illegible]
156 pages (Persian Grammar in Urdu language)

میر تقی میر

(۱۷۲۳ء تا ۱۸۱۰ء)

میر محمد تقی اکبر آباد میں محمد علی المعروف بہ علی متقی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ باپ درویش منش تھے۔ میر کو گیارہ بارہ سال کی عمر میں سوتیلے بھائی کے سایہ میں چھوڑ کر راہی عدم ہوئے۔ بچپن میں میر کی صحبت بھی صوفیوں، درویشوں سے رہی کیونکہ گھر کا ماحول وہی تھا۔ باپ نے کوئی اثاثہ بھی نہیں چھوڑا۔ اس لئے میر کی مالی مشکلات اور ذہنی پریشانیاں کمسنی ہی سے شروع ہو گئیں وہ دہلی چلے گئے اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں رہنے لگے۔ وہ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے لیکن کسی وجہ سے میر سے ان کے تعلقات خراب ہوتے گئے۔ میر مختلف قسم کی ملازمتیں کرتے رہے لیکن مستقل پریشانیوں کا شکار رہے۔ اسی زمانے میں انھیں شاعری کا شوق بھی ہوا اور ایک بار دیوانگی کی منزل سے بھی گذرے دہلی اس زمانے میں ہنگامہ آرائیوں کا مرکز تھی۔ روہیلے، جاٹ، سکھ مرہٹے ایک طرف، بیرونی حملے دوسری طرف، ایسٹ انڈیا کمپنی کا دباؤ تیسری طرف اور مغل حکومت کی اندرونی بدحالی چوتھی طرف سب نے

مل کر دہلی کو ویرانہ بنا دیا۔ میرؔ بے حد حساس دل رکھتے تھے سو وہ ان
تمام باتوں سے متاثر ہوئے، زندہ رہنے کی جدوجہد کرتے رہے اور
شاعری میں ریاض جاری رہا لیکن آخرکار مجبور ہو کر دوسرے
شعراء کی طرح وہ بھی آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آ گئے تاکہ انکی
سرپرستی حاصل کریں۔ وہ سرپرستی انہیں حاصل بھی ہو گئی لیکن میرؔ کی
ناآسودگی، اطمینان میں تبدیل نہ ہو سکی۔ اسی حالت میں اچھی خاصی
عمر پا کر لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔

میرؔ اردو کے اہم ترین شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ فارسی میں
کئی کتابوں کے علاوہ اردو میں ان کے چھ دیوان ہیں جن میں غزلوں
کے علاوہ مثنویاں، قصیدے، ہجویہ مخمس، مستزاد، قطعات
رباعیات، مرثیے، واسوخت، شکارنامے بھی شامل ہیں۔ ایک ایسے شاعر کا
سرمایہ ہونے کی حیثیت سے ان کے ہر شعر اور ہر لفظ کو اہمیت
حاصل ہے لیکن درحقیقت وہ اپنی غزلوں اور بعض مثنویوں کی
وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں آپ بیتی کے انداز میں
جگ بیتی ہیں۔ ان کی اپنی ذات ہر اس انسان کی ذات ہے جو
وقت کو اپنے مزاج کے مطابق نہ پا کر دل گرفتہ اور ناآسودہ رہا
ہے۔ تصوف اور حرماں نصیبی کے ابتدائی نقوش کبھی نہیں
مٹے، غمِ زندگی نے دامن اس طرح پکڑ لیا کہ آخر عمر تک نہیں چھوڑا۔
چنانچہ یہی ان کی شاعری کا مزاج بن گیا۔ اُن کی غزل میں

وہ رجائیت، تاثیر، سوز و گداز، جذباتی شدت ہے جس سے غزل
غزل ہی میں میر کا ایک کردار رہے اور ایک شخصیت ہی انکی
شاعری میں جلوہ گر ہے۔ ان کی زبان سادہ لیکن معنی خیز ہے اور وہ
اپنی بات کہنے کا وہ سلیقہ ہے جو ہر شاعر کو نہیں آتا۔ وہ
تخلیقی فن کاری کو آتا ہے۔

میر کا مطالعہ کرنے کے لئے حسب ذیل کتب اور
رسالے دیکھنا مفید ہوگا:

کلام میر (مرتبہ عبدالحق)، انتخاب میر (علی سردار جعفری)،
انتخاب میر (نور الحسن)، میر تقی میر حیات اور شاعری (ڈاکٹر
خواجہ احمد فاروقی)، نکات الشعراء (میر)، ذکر میر (ترجمہ)

انتخاب غزلیات میر

(۱)

کب تلک قابل ہی دل صد پارہ اس نخچیر کا
جیسے ہر ٹکڑے پہ ہے پیوست پیکاں تیر کا

سب کھلا باغ جہاں الا یہ حیران و خفا
جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

بوئے خوں سے جی رکا جاتا ہے اے باد بہار
ہو گیا ہے چاک دل شاید کسو دلگیر کا

رہ گزر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

بس طبیب اٹھ جا مری بالیں سے مت دے درد سر
کام جاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا

نالہ کش ہیں عہد پیری میں بھی تیرے در پہ ہم
قد خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا

جو ترے کوچے میں آیا پھر وہیں گاڑا اُسے
تشنۂ خوں ہیں تو ہوں اُس خاکِ دامنگیر کا

لختِ دل سے جوں چھڑی پھولوں کی گوندھی ہے ولے
فائدہ کچھ اے جگر اس آہِ بے تاثیر کا

گورِ مجنوں سے نجاویں گے کہیں ہم بے نوا
عیب ہے ہم ہیں جو چھوڑیں ڈھیر اپنے پیر کا

کس طرح سے مانیے یارو! کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

(۲)

خوبی کا اس کی بس کہ طلبگار ہو گیا
گل باغ میں گلے کا میرے ہار ہو گیا

کس کو یقیں ہے شوق ترا پر نہ اس قدر
میں تو اسی خیال میں بیمار ہو گیا

میں نو دمیدہ بال چمن زاد طیر تھا
پر گھر سے اُڑ چلا سو گرفتار ہو گیا

ٹھہرا گیا نہ ہو کے حریف اُس کی چشم کا
سینے کو توڑ تیرِ نگہ پار ہو گیا

ہے اُس کے حرفِ زیرِ لبی کا سبھوں میں ذکر
کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہو گیا

تو وہ متاع ہے کہ پڑی جس کی تجھ پہ آنکھ
وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہو گیا

کیا کہیے آہ! عشق میں خوبی نصیب کی
دل دار اپنا تھا سو دل آزار ہو گیا

آٹھوں پہر لگا ہی پھرے ہے تمہارے ساتھ
کچھ ان دنوں میں غیر بہت یار ہو گیا

کب رُو ہے اس سے بات کے کرنے کا مجھ کو میر
ناکردہ جرم میں تو گنہ گار ہو گیا

(۳)

آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا
اس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا

پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا

اس موجِ خیزِ دہر میں ہم کو قضا نے آہ!
پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا

تھی لاگ اس کی تیغ کو ہم سے سو عشق نے
دونوں کو معرکے میں گلے سے ملا دیا

سب شورِ ما و من کو لئے سر میں مر گئے
یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

اجزا بدن کے جتنے تھے پانی ہو بہ گئے
آخر گدازِ عشق نے ہم کو بہا دیا

کیا کچھ نہ تھا ازل میں نہ طالع جو تھے درست
ہم کو دلِ شکستہ قضا نے دلا دیا

گویا محاسبہ مجھے دینا تھا عشق کا
اس طور دل سی چیز کو میں نے اٹھا دیا

ہم نے تو سادگی سے کیا جی کا بھی زیاں
دل جو دیا تھا سو تو دیا سر جدا دیا

اُن نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میر
ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

(۴)

اُس کے کوچے سے جو اُٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں
تا نظر کام کرے رو بہ قضا جاتے ہیں

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

وقتِ خوش اُنکا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو
در و دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں

جائے گی طاقتِ پا آہ تو کریئے گا کیا
اب تو ہم حال کبھو تم کو دکھا جاتے ہیں

ایک بیمارِ جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر
پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

غیر کی تیغِ زباں سے تری مجلس میں تو ہم
آ کے روز ایک نیا زخم اٹھا جاتے ہیں

عرضِ وحشت نہ دیا کر تو بگولے اتنی
اپنی وادی پہ کبھو یار بھی آ جاتے ہیں

میر صاحب بھی ترے کوچے میں شب آتے ہیں لیک
جیسے دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

(۵)

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

بوئے گل اور رنگ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم!
لیک بقدرِ یک نگاہ دیکھیے تو وفا نہیں

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدانخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں

چشم سفید و اشک سرخ آہ دلِ حزیں ہے یاں
شیشہ نہیں ہے مے نہیں ابر نہیں ہوا نہیں

ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں

آب و ہوائے ملکِ عشق تجربہ کی ہے میں بہت
کر کے دوائے دردِ دل کوئی بھی پھر جیا نہیں

ہووے زمانہ کچھ سے کچھ چھوٹے ہے دل لگا مرا
شوخ کسی بھی آن میں تجھ سے تو میں جدا نہیں

نازِ بتاں اٹھا چکا دیر کو میرؔ ترک کر
کعبے میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

(۶)

نسیم مصر کب آئی سوادِ شہر کنعاں کو — نہ جب تک چھو لی یاں سے لگی گل ہائے حیراں کو

زبانِ نوحہ گر ہوں میں قضا نے کیا ملایا تھا
میری طینت میں یا رب سجدۂ دل لگے یاراں کو

کوئی کانٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہے
گلِ گلزار کیا درکار ہے گورِ غریباں کو

یہ کیا جانوں ہوا سینے میں کیا اس تنگ کو ناصح
سحر خوں بستہ تو دیکھا تھا میں اپنی مژگاں کو

صدا آئے آہ جیسے تیر جی کے پار ہوتی ہے
کسو بیدرد نے کھینچا کسو کے دل سے پیکاں کو

کریں پامال لک فرشِ رہ اس ساعت کہ حشر ہو
لہو ڈوبا کفن لاویں شہیدِ ناز خوباں کو

گیا بیزار ہو تربت کا بہت آسائش کے سو تو
کسو دیوانے سے بیں حشر پکڑے داماں کو

ہمارے سہل ہے دیتے ہیں کس محبوب کو کف سے
قلم ان جرعہ کرتا ہے دستِ گل فروشاں کو

تری ہی جستجو میں گم ہوا ہے کہ کہاں کھویا
جگر خوں گشتہ دل آزردہ میر اس خانہ ویراں کو

(ط)

نالہ تا آسمان جاتا ہے
شور سے جیسے بان جاتا ہے

دل عجب جنس ہے ولیکن مفت
ہاتھ سے یہ گراں جاتا ہے

تیغ تیزی ہے چشمک اس کی جھل
تشنہ اک جہان جاتا ہے

جب سرِ راہ آئے ہے وہ شوخ
ایک عالم کا جان جاتا ہے

اس سخن ناشنو سے کیا کہیے
غیر کی بات مان جاتا ہے

عشق کے داغ کا نہیں ہے علاج
کوئی اب یہ نشان جاتا ہے

گو وہ ہرجائی آئے اپنی اور
سو طرف ہی گمان جاتا ہے

میر گو عمر طبعی کو پہنچا
عشق میں جوں جوان جاتا ہے

(۸)

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

خاطر بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں
خاک مانند بگولے کے اڑانی اس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مینہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اس کی

کر کے تعویذ رکھیں اس کو بہت بھاتی ہے
وہ نظر پاؤں پہ وہ ناتوانی اس کی

اس کا وہ عجز تمہارا یہ غرور خوبی
منتیں اس نے بہت کیں پہ نہ مانی اس کی

سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی

اب گئے اس کے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

مرزا اسداللہ خاں غالب

(۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء)

مرزا اسداللہ نام، اسدؔ اور غالبؔ تخلص، نجم الدولہ دبیر الملک خطاب، مرزا غالب ایبک ترکوں کے ایک خاندان میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ باپ دادا کا پیشہ سپہ گری تھا۔ لیکن مرزا نے تلوار کی جگہ قلم سنبھالا۔ باپ اور چچا کے انتقال کے بعد کچھ دن خوش حالی نانہال میں گذرے۔ تیرہ سال کی عمر میں شادی ہوگئی اور زندگی کی الجھنیں شروع ہوگئیں۔ خاندانی پنشن جس کا وہ خود کو حقدار سمجھتے تھے، دوسروں میں بٹ گئی، اس کے لئے انھیں بڑی جد و جہد کرنی پڑی۔ اس سلسلہ میں کلکتہ بھی گئے۔ لکھنؤ میں بھی قیام کیا لیکن وہ فارغ البالی واپس نہ آئی جو ابتدائی زندگی میں رہ چکی تھی۔ غالبؔ نے اپنے خطوں میں ان تمام باتوں کا ذکر بڑے دلکش اور پر اثر انداز میں کیا ہے لیکن اس کے داخلی اثرات ان کی شاعری میں ظاہر ہوئے ہیں۔ عمر کے آخری حصہ میں مغل اور رامپور دربار سے وابستگی نے دشواریاں کچھ کم کر دی تھیں لیکن آسودگی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔

شادی کے بعد جب غالب دہلی میں رہنے لگے تو شعر و شاعری کا وہ ذوق جس کی ابتدا آگرہ میں ہو چکی تھی، اچھی طرح چمک اٹھا

اُن کی بُت شکن طبیعت نے دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنے کے بجائے شاعری میں اپنی راہ آپ نکالنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں بے راہ روی بھی ہوئی، لوگوں نے مہمل گو بھی کہا اور خود انھیں بھی کہنا پڑا کہ اگر میرے اشعار میں معنی نہیں ہیں تو نہ سہی، مجھے کسی کی تعریف و تحسین کی پروا نہیں۔ لیکن کوئی شاعر اپنے سننے والوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ غالب کو بھی اپنا رنگ بدلنا پڑا۔ ذہانت اور ذکاوت، فکر و تجسس، زندگی کی کشمکش اور تجربات، فارسی زبان و ادب کی اعلیٰ واقفیت، انفرادی نقطۂ نگاہ اور شگفتگی مزاج نے اُن کی شاعری میں وہ جادو بھر دیا جو بڑی مشکل سے کسی شاعر کے نصیب میں آتا ہے۔ غالب نے اپنی جدتِ طبع اور ندرتِ اظہار سے سیدھے سادے انسانی تجربات کو گہرائی اور فلسفیانہ انداز سے پیش کر کے غزل میں فکری عنصر کا اضافہ کیا۔ کیا غزل کیا قصیدہ انھوں نے دونوں میں اچھوتا اور مجتہدانہ رنگ پیدا کیا۔ ان کی اردو شاعری کے کئی رنگ ہیں۔ شروع میں مشکل اور فارسی آمیز زبان، دور از کار تشبیہات اور استعاروں نے ان کی ہردلعزیزی کو نقصان پہنچایا۔ پھر جب بدلے تو شگفتگی اور معنویت دونوں میں اضافہ ہوا۔ غیر مانوس ترکیبوں کی جگہ خوبصورت الفاظ اور فقروں سے اور نازک خیالی کے باوجود سادہ الفاظ سے کام لینے لگے۔ مزاج کی شوخی نے

تازہ کاری پیدا کی اور اس طرح اردو شاعری کے آبرو بن گئے۔
غالب کا مطالعہ ہر شخص نے اپنے خاص نقطۂ نظر سے کیا ہے
اس لئے ان کے متعلق رائے قائم کرتے وقت غور و فکر سے کام لینے
کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں یادگارِ غالب، محاسن کلامِ غالب
(عبدالرحمٰن بجنوری)، نقدِ غالب (مختار الدین)، حکیم فرزانہ
(محمد اکرام)، مطالعۂ غالب (اثر لکھنوی) کا مطالعہ مفید ہوگا۔

غزلیاتِ غالب

(١)

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۲)

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

(۳)

جو سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

(۴)

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

(۵)

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو ۔۔۔ جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے ۔۔۔ اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود ۔۔۔ قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے ۔۔۔ خارِ رہ کو ترے ہم مہرِ گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا ۔۔۔ آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ ۔۔۔ اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

(۶)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں ۔۔۔ کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں ۔۔۔ شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر ۔۔۔ آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں ۔۔۔ میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ۔۔۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے ۔۔۔ کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ۔۔۔ ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے ۔۔۔ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ۔۔۔ ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ۔۔۔ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے ق جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

(۷)

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

(۸)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام — دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۹)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

(۱۰)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اسکی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ولی محمد نظیر اکبر آبادی

(۱۷۴۰ء تا ۱۸۳۰ء)

نظیر پیدا تو دہلی میں ہوئے لیکن کم سنی ہی میں آگرہ چلے آئے اور پھر وہی ان کا وطن بن گیا۔ نظیر کی زندگی کے حالات تفصیل سے معلوم نہیں بس اتنا معلوم ہے کہ وہ آگرہ میں معلمی کرکے پیٹ پالتے تھے۔ فارسی عربی اور بعض ہندوستانی زبانوں سے واقف تھے اور ہندوستانی سماج کے سبھی پہلوؤں سے دلچسپی لیتے تھے۔ انھیں لکھنؤ، دہلی، حیدرآباد کے علاوہ بعض دوسرے درباروں نے بھی کھینچنا چاہا لیکن عام زندگی میں وہ اس قدر رس بس گئے تھے کہ کہیں نہیں گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ درباری اثرات اور رسمی رنگ شاعری سے بچ کر زندگی کے عام واقعات اور مسائل کی طرف متوجہ ہوئے اور عام لوگوں کے مذاق کے مطابق نظمیں لکھنے لگے۔ اس عہد میں جس قسم کی غزل گوئی، قصیدہ نگاری اور مثنوی نگاری کا رواج تھا، نظیر نے اپنی راہ اس سے الگ نکالی۔ اسی وجہ سے اس زمانے کے تذکرہ نگاروں نے انھیں کوئی اہمیت نہیں دی۔ کسی نے بازاری شاعر کہا، کسی نے کہا کہ شعراء کے مقررہ قاعدے کے مطابق نہیں کہتے اس لئے ان کا شمار

شعرا میں نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن جب مذاقِ سخن بدلا اور لوگ شاعری میں حقیقت، مسائلِ حیات، عمومیت اور تنوع کو پسند کرنے لگے تو نظیر کی جانب بھی نگاہ گئی۔ موجودہ عہد کے کئی شعراء نہ صرف ان سے متاثر ہیں بلکہ اکثر نقاد انھیں اعلیٰ پایہ کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ نظیر نے نہ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی اور نہ باقاعدہ شاعری کو اپنا پیشہ بنایا بلکہ اپنے ذوق کے مطابق ہر اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا جس نے انھیں متاثر کیا۔

ان کے کلیات میں غزلیں، ریختے، مثنویاں بھی ہیں۔ لیکن ان کی اصلی شہرت ان نظموں کی وجہ سے ہے جو انھوں نے بیشتر مخمس یا مسدس کی شکل میں لکھی ہیں اور جن میں عام رسموں، تیوہاروں، تفریحوں، میلوں، پھلوں پھولوں، جانوروں، پرندوں کے علاوہ زندگی کی مختلف منازل، مناظرِ فطرت، ضروریاتِ زندگی، فقر و فنا، محبت و عبرت، مفلسی، تونگری اور فلسفۂ حیات کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ عام، سادہ اور بول چال کی زبان میں وہ ہندوستان کے ہر طبقہ اور مذہب کے لوگوں اور ان کے مسئلوں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ کچھ تو وہ زبان کی صحت، تراش خراش اور فن کی نزاکتوں کی فکر نہیں کرتے اور کچھ اپنے موضوع کی مناسبت سے ایسے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو پڑھے لکھے لوگوں کی زبانوں پر چڑھے

نہیں ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان اور اسلوب شاعری کے مقررہ معیاروں کے مطابق نہیں۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن انھوں نے شاعری کو زندگی سے اس قدر قریب کر دیا کہ ان کی اس کمی کی تلافی ہو جاتی ہے اور وہ ہندوستانی زندگی کے اعلیٰ ترجمان قرار پاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ میں روح نظیر (مخمور اکبرآبادی) گلزار نظیر (سلیم جعفر) نظیر اور ان کا عہد (ابواللیث صدیقی) نگار لکھنؤ (نظیر نمبر ۱۹۴۱ء) سے مدد لی جا سکتی ہے۔

کچھ نظمیں

(۱) کلجگ کے بیان میں

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے
نیکی کا بدلا نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے
کانٹا کسی کے مت لگا گر مثل گل پھولا ہے تو
وہ تیرے حق میں زہر ہے جس بات پر پھولا ہے تو

مت آگ میں ڈال اور کو پھر گھانس کا پولا ہے تو
سُن رکھ یہ نکتہ بے خبر، کس بات پر بھولا ہے تو
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہات دے اُس ہات لے

شوخی شرارت مکر و فن، سب کا بسیکھا ہے یہاں
جو جو دکھایا اور کو، وہ آپ دیکھا ہے یہاں
کھوٹی کھری جو کچھ کہ ہے، اُس کا پرکھا ہے یہاں
ہر سو پڑا تلتا ہے دل، تل تل کا لیکھا ہے یہاں
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہات دے اُس ہات لے

جو اور کو پھل دیوے گا، وہ بھی سدا پھل پاوے گا
گیہوں سے گیہوں، جو سے جو، چانول سے چانول پاوے گا
جو آج دیوے گا یہاں، ویسا ہی وہ کل پاوے گا
کل دیوے گا کل پاوے گا، کل پاوے گا کل پاوے گا
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہات دے اُس ہات لے

جو چاہے لے چل اس گھڑی، سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے، آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں، دریا کی یہ منجدھار ہے

اوروں کا بیڑا پار کر، تیرا بھی بیڑا پار ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اُس ہات لے

تو اور کی تعریف کر، تجھ کو ثنا خوانی ملے
کر مشکل آساں اور کی، تجھ کو بھی آسانی ملے
تو اور کو مہمان کر، تجھ کو بھی مہمانی ملے
روٹی کھلا روٹی ملے، پانی پلا پانی ملے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اُس ہات لے

یاں زہر دے تو زہر لے، شکر میں شکر دیکھ لے
نیکوں کو نیکی کا مزا، موذی کو ٹکر دیکھ لے
موتی جو دے موتی ملیں، پتھر میں پتھر دیکھ لے
گر تجھ کو یہ باور نہیں، تو تو بھی کر کر دیکھ لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اُس ہات لے

اپنے نفع کے واسطے، مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصاں ہووے گا، اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر، پانی پیے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر، اور خوف سے گزران کر

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے

غفلت کی یہ جاگہ نہیں، یاں صاحبِ ادراک رہ
دلشاد رکھ دلشاد رہ، غمناک رکھ غمناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیرؔ اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکاں ہے او میاں! یاں پاک رہ بیباک رہ
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے

(۲) آدمی نامہ

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال، قطب، غوث، ولی آدمی ہوئے — منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے لیے — حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا — شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا — یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطان بھی آدمی ہے جو کرتا ہے کینہ زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال
سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ
قاضی وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ
دوڑے ہیں آدمی ہی تو مشعل جلا کے راہ
اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار
اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں دوڑے بغل میں مار
کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار
اور اس میں جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا

کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا — کس کس طرح کی بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل و جواہر ہیں بے بہا — اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ الٹا ہے جوں توا — گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا
بد شکل بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جنکے یہ کچھ زرق برق ہیں — روپے کے انکے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھلکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں — کمخواب تاش شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرتے ہیں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار — نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار — سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر — یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کار دلپذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر — اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(۳) شہر آشوب

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند — رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے منجمد دھار بند — ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ
آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے بُرے وقت سے پناہ
وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

صراف بنئے جوہری اور سیٹھ ساہوکار
دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب اُدھار
بازار میں اُڑے ہے پڑی خاک بے شمار
بیٹھے ہیں یوں دکانوں پہ اپنی دکاندار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

سوداگروں کو سود نہ بیوپاریوں کو فلاح
بزاز کو ہے نفع نہ پنساری کو فلاح
دلال کو ہے یافت نہ بازاری کو فلاح
دکھیا کو فائدہ نہ پسہاری کو فلاح
یاں تنگ ہوا ہے آن کے لوگوں کا کار بند

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہیں تن لوہار تو پیٹے ہیں سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشہ والوں کے ہیں کاروبار بند

محنت سے ہاتھ پاؤں کے کوڑی نہ ہاتھ آئے
بیکار کب تلک کوئی قرض و ادھار کھائے
دیکھوں جسے وہ کرتا ہے رو رو کے ہائے ہائے
آتا ہے ایسے حال پہ رونا ہمیں تو ہائے
دشمن کا بھی خدا نہ کرے کاروبار بند

آمد نہ خادموں کے تئیں معتبروں کے بیچ
باھمن بھی سر پٹکتے ہیں سب مندروں کے بیچ

عاجز ہیں پڑھنے والے بھی سب اس زمانے بیچ
حیراں ہیں پیرزادے بھی اپنے گھروں کے بیچ
نذر و نیاز ہو گئی سب ایک بار بند

کیا چھوٹے کام والے وہ کیا پیشہ ور نجیب
روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آ شام عنقریب
اٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند

قسمت سے چار پیسے جنہیں ہاتھ آتے ہیں
البتہ روکھی سوکھی وہ روٹی پکاتے ہیں
جو خالی آتے ہیں وہ قرض لینے جاتے ہیں
یوں بھی نہ پایا کچھ تو فقط غم کو کھاتے ہیں
سوتے ہیں کر کواڑ کو اک آہ مار بند

کیونکر بھلا نہ مانگیے اس وقت سے پناہ
محتاج ہو کے پھرنے لگے در بدر سپاہ
یاں تک امیرزادے سپاہی ہوئے تباہ
جن کے جلو میں چلتے تھے ہاتھی و گھوڑے آہ
وہ دوڑتے ہیں اور کی پکڑے تفنگ کا ربند

ہے اب سپاہ مرد کا دشمن زمانہ ہے
روٹی سوار کو ہے نہ گھوڑے کو دانہ ہے
تنخواہ نے طلب ہے نہ پینا نہ کھانا ہے
پیادے دو والی بند کا پھر کیا ٹھکانا ہے
در در خراب پھرنے لگے جب نقار بند

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانجات
سب پر پڑی ہے آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہیے بات
روزی کے اب درخت کا ہلتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند

ہے کون سا وہ دل جسے فرسودگی نہیں
وہ گھر نہیں کہ روزی کی نابودگی نہیں
ہرگز کسی کے حال میں بہبودگی نہیں
اب آگرے میں نام کو آسودگی نہیں

کوڑے کی آکے ایسی ہوئی دو گھڑی میں بند

ہے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ
ٹوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ
ہوتا ہے باغباں سے ہر اک باغ کا نباہ
وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے آہ
جس کا نہ باغباں ہو نہ مالک نہ خاربند

کیوں یارو اس مکاں میں یہ کیسی چلی ہوا
جو مفلسی سے ہوش کسی کا نہیں بجا
جس ہر سرا میں ہوا ہے دیوانہ ہو رہا
سودا ہوا مزاج زمانہ کو یا خدا
تو ہے حکیم کھول دے اب اس کے چار بند

ہے میری حق سے اب یہ دعا شام اور سحر
کر آگرے کی خلق پہ اب مہر کی نظر
سب کھاویں پیویں یاد رکھیں اپنے اپنے گھر
اس ٹوٹے شہر پر بھی الٰہی تو فضل کر
کھل جاویں ایک بار تو سب کاروبار بند

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے
اس واسطے یہ اس نے لکھے پانچ چار بند

میر ببر علی انیس

(۱۸۰۳ء تا ۱۸۷۴ء)

میر انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں کئی پشتوں سے شاعری چلی آتی تھی۔ ان کے پردادا میر ضاحک، دادا میر حسن باپ میر خلیق سبھی تاریخ ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم فیض آباد ہی میں ہوئی۔ فارسی اور عربی کے علاوہ فنون سپہ گری سے بھی واقفیت بہم پہونچائی۔ شروع میں غزل گوئی کی طرف توجہ فرمائی مگر باپ کے مشورے سے سلام اور مرثیے کہنے لگے۔ اس زمانے میں لکھنؤ علمی اور ادبی مرکز بن رہا تھا اور شعراء کے ساتھ مرثیہ نگاروں کو بھی شہرت اور اہمیت حاصل ہو رہی تھی۔ چنانچہ مرزا دبیر جو میر ضمیر کے شاگرد تھے جدید طرز کے مرثیہ نگاروں میں بڑی اہمیت رکھتے تھے میر انیس بھی قسمت آزمائی کے لئے لکھنؤ آئے اور تھوڑے ہی دنوں میں میرزا دبیر کے مدمقابل قرار دے گئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں سے پہلے میر انیس کہیں نہیں گئے بلکہ اہل لکھنؤ ہی کی قدردانی کا لطف اٹھاتے رہے۔ لیکن لکھنؤ کی بساط الٹ گئی تو بنارس، الہ آباد، پٹنہ اور حیدرآباد بھی گئے اور غیر معمولی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ میر انیس بڑے غیور، خوددار، پابند وضع صاحب کمال تھے پھر ایک ایسے اور اہم سنجیدہ موضوع پر

شاعری کرتے تھے کہ لوگ ان کی عزت پر مجبور تھے۔ وہ امراء اور سلاطین کو بھی اسی لئے خاطر میں نہیں لاتے تھے کہ وہ ذاکر امام تھے۔ شہرت کی اعلیٰ منزل پر پہونچ کر انھوں نے لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔

میر انیس کے مراثی کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ متعدد مرتب کرنے والوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے یہ مرثیے مرتب کیے ہیں جو کبھی تین کبھی چار اور کبھی پانچ جلدوں میں شائع ہوئے ہیں ابھی کچھ کلام غیر مطبوعہ بھی موجود ہے۔ سلاموں اور رباعیوں کے مجموعے بھی الگ الگ شائع ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے۔ میر انیس پانچ پشتوں سے مرثیہ گوئی کر رہے تھے۔ لیکن مرثیہ کو اصل فروغ مرزا سودا کے بعد میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر اور مرزا فصیح کے ہاتھوں حاصل ہوا۔ میر انیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے تمام فنی لوازم کو برتتے ہوئے اور عقیدہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اعلیٰ پائے کی ایسی نظمیں لکھیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے مرثیہ ہیں لیکن اپنی وسعت کے لحاظ سے بلند پایہ رزمیہ اور اخلاقی نظموں کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ میر انیس نے قدرت بیان کا وہ معجزہ دکھایا ہے کہ ہر موقع اور محل، ہر ذہنی اور جذباتی کیفیت کو مخصوص حقیقت پسندانہ رنگ میں پیش کر دیا ہے۔ محاکات نگاری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کی جتنی اچھی مثالیں میر انیس کے یہاں ملیں گی کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے مل سکیں گی۔ ان کا موضوع ظناً

ارفع اور اعلیٰ تھا ویسی ہی ان کی شاعری ہے۔ اس انتخاب میں ایک مشہور مرثیہ کا ابتدائی حصہ شامل کیا گیا ہے۔ ان کے متعدد مراثی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ میر انیس کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا۔

موازنہ انیس و دبیر (مولانا شبلی)۔ روح انیس (مسعود حسن رضوی)
میر انیس (سفارش حسین)، یادگار انیس (امیر احمد علوی)
مطالعہ انیس (ظہیر احمد صدیقی)۔

انتخاب مرثیہ

(۱)
نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری — ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری — شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

(۲)
ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں — بحر مواج فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں ذروں کو انجم کر دوں — گنگ کو ماہر انداز تکلم کر دوں
درد سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

(۳)
جس ثنا خواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مداح — جد اعلیٰ سا نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مداح
باپ مداح کا مداح ہے دادا مداح — ہم ذی قدر ثنا خوانوں میں یکتا مداح

جو عنایاتِ الٰہی سے ہوا ایک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

(۴)

کیوں نہ ہو بندۂ موروثی مولا ہوں میں — قلزمِ رحمتِ معبود کا قطرہ ہوں میں
جنہیں لکھوں دُرِ مرجاں ہیں وہ دریا ہوں میں — مدح خوانِ پسرِ حضرتِ زہرا ہوں میں
وصف جوہر کا کروں یا صفتِ ذات کروں
اپنے رتبے پہ نہ کیوں آپ مباہات کروں

(۵)

مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یا رب — شوقِ مداحیٔ شبیر عطا کر یا رب
سنگ ہو موم وہ تقریر عطا کر یا رب — نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یا رب
جدِ آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہوں گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

(۶)

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہلِ شعور — ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
غل ہو یہ ہے کششِ موقلمِ طرۂ حور — ایک اک حرف میں ہو صنعتِ صانع کا ظہور
کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے
نقشِ ارژنگ کو کاواک لکیریں سمجھے

(۷)

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ — شمعِ تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ — خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی (۸) لب و لہجہ ہو وہی سارا متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے (۹) سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لئے
داند آں کس کہ فصاحت بکلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا (۱۰) یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہے جدا مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

یہ اصبح شہادت کا بیاں کرتا ہوں (۱۱) رنج و اندوہ و مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں ایک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہوں گے نہ صاحب ایسا

صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور (۱۲) زمزمے کرنے لگے یادِ الٰہی میں طیور
مثلِ خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور

(۱۷) کیا جوانانِ خوش اطوار تھے سبحان اللہ — کیا رفیقانِ وفادار تھے سبحان اللہ
صفدر و غازی و جرّار تھے سبحان اللہ — زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ
زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمدؐ کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

(۱۸) اللہ اللہ عجب فہم عجب غازی تھے — عجب اسوار تھے بے مثل عجب بازی تھے
لائقِ مدح و سزاوارِ سرافرازی تھے — گو بہت کم تھے پہ آمادۂ جانبازی تھے
پیاس ایسی تھی کہ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

(۱۹) زہد میں حضرت سلماں کے برابر کوئی — دولتِ فقر و قناعت میں ابا ذر کوئی
صدق گفتار میں عمّار کا ہمسر کوئی — حمزۂ عصر کوئی، مالکِ اشتر کوئی
ہوں گے ایسے ہی محمدؐ کے جو شیدا ہوں گے
پھر جہاں ایسا نہ ہوگا نہ وہ پیدا ہوں گے

(۲۰) گو مصیبت میں تہِ ظلم تباہی میں رہے — سر کٹے پاؤں مگر راہِ الٰہی میں رہے
یوں سرافراز وہ سب لشکرِ شاہی میں رہے — جیسے تیغِ دو دم دستِ سپاہی میں رہے
اس مصیبت میں نہ پایا کبھی شاکی اُن کو
آبرو ساقیٔ کوثر نے عطا کی اُن کو

(۲۱) وہ تخشّع وہ تضرّع وہ قیام اور قعود — وہ تذلّل وہ دعائیں وہ رکوع اور وہ سجود
یادِ حق دل میں تو سمٹے ہوئے ہونٹوں پہ درود — یہ دعا خالقِ اکبر سے کہ اے ربِّ ودود

[illegible]

(۲۶)

وہ بہشتی نے کہا جس کو وفا کہتے ہیں سب اُنھیں عاشقِ شاہِ شہدا کہتے ہیں
اُن کو قبلہ تو اُنھیں قبلہ نما کہتے ہیں جو بہادر ہیں وہ شمشیرِ خدا کہتے ہیں
عشق سردار و علمدار کا افسانہ ہے
وہ چراغِ رہِ دیں ہے تو یہ پروانہ ہے

(۲۷)

اک طرف اکبرِ مہرو سا جوانِ نایاب کچھ جو بچپن تھا تو کچھ آمدِ ایامِ شباب
روشنی چہرے پہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب آنکھیں ایسی کہ رہا نرگسِ شہلا کو حجاب
جس نے ان گیسوؤں میں رُخ کی ضیا کو دیکھا
شبِ معراج میں محبوبِ خدا کو دیکھا

(۲۸)

اے خوشا حُسنِ رُخِ یوسفِ کنعانِ حسن راحتِ روحِ حسین ابنِ علی جانِ حسن
جسم میں زورِ علی طبع میں احسانِ حسن ہمہ تن خَلقِ حسن حسن میں شانِ حسن
تن پہ بھرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی بچپن میں شہانی پوشاک

(۲۹)

اللہ اللہ اسد اللہ کے نواسوں کا جلال چاند سے چہروں پہ بل کھاتے ہوئے زلفوں کے بال
نیمچے کاندھوں پہ رکھے ہوئے مانندِ ہلال گرچہ بچپن تھا پہ رستم کو سمجھتے تھے زال
صف سے گھوڑوں کو بڑھا کر جو پلٹ جاتے تھے
پرے لشکرِ کفار کے ہٹ جاتے تھے

(۳۰)

آستینوں کو چڑھائے ہوئے آمادۂ جنگ وہی سارا اسد اللہ کا نقشہ وہی ڈھنگ
سُرخ چہرے تھے کہ شیروں کا یہی ہوتا ہے رنگ ولولہ صف کے اُلٹنے کا لڑائی کی اُمنگ

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۴ء)

خواجہ الطاف حسین حالی قصبہ پانی پت میں انصاریوں کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فارسی اور عربی کی وطن ہی میں ہوئی۔ ابھی سترہ سال کی عمر تھی کہ شادی ہو گئی۔ کچھ معاشی الجھن، کچھ شادی کی قید، تعلیم ادھوری رہ گئی اور وہ خاموشی سے دہلی چلے گئے۔ غدر سے پہلے دہلی میں علم و ادب کی بہار آئی ہوئی تھی، جدید تعلیم کے لئے دہلی کالج وجود میں آ چکا تھا۔ حالی نے ایک معمولی سی ملازمت کر لی تاکہ دہلی کالج میں رہ کر اپنے ادبی اور علمی ذوق کی تکمیل کر سکیں لیکن ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ انقلاب بپا ہوا اور انھیں پانی پت واپس آنا پڑا۔ وطن پہنچ کر حالی پھر تحصیل علم میں لگ گئے لیکن دہلی نے پھر کھینچا اور وہاں پہنچ کر وہ مرزا غالب کے متعارف ہوئے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے تعلقات قائم ہو گئے پھر حالی ۱۸۶۹ء تک انھیں کے ساتھ رہے۔ اس سال غالب اور شیفتہ دونوں کا انتقال ہوا تو حالی دہلی سے نکلے اور لاہور گئے وہاں گورنمنٹ کے محکمۂ تالیف و تصنیف میں ملازمت مل گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد کا ساتھ ہوا اور حالی نے انجمن پنجاب کے لئے اپنی مشہور نظمیں برکھا رت، حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف لکھیں۔ یہی زمانہ

تھا جب سرسید نے اپنی اصلاحی اور تعلیمی تحریک شروع کی تھی۔ رسالہ "تہذیب الاخلاق" نکالا تھا اور بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان اس تحریک سے متاثر تھے۔ حالی دہلی واپس آئے اور اینگلو عربک کالج میں ملازم ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنا مشہور مسدس "مدوجزر اسلام" لکھا۔ یہاں سے حالی کی حیثیت ایک ادبی رہنما کی ہو جاتی ہے۔ ۱۹۰۱ء میں شمس العلماء ہوئے نظام حیدر آباد کے یہاں سے وظیفہ مقرر ہوا اور حالی اپنا سارا وقت علمی کاموں میں صرف کرنے لگے۔

حالی نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے شروع کی تھی اور اس میں اچھا خاصا انفرادی رنگ بھی پیدا کر لیا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں غالب کا مرثیہ لکھ کر ایک نظم گو کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کر لی تھی لیکن جب لاہور میں محمد حسین آزاد کے ساتھ انجمن پنجاب میں شریک ہوئے تو ان کا شمار جدید شاعری کے معماروں میں ہونے لگا۔ اس وقت سے انھوں نے اپنی رام کہانی چھوڑ کر قوم کی اصلاح کا ترانہ چھیڑا۔ غزلوں میں بھی اصلاح کی اور نظموں کو قومی تعمیر کے لئے وقف کر دیا۔ ان کا نقطۂ نظر اصلاح پسندانہ اور اخلاقی تھا اور شاعری کو اسی تعمیری مقصد کے کام میں لانا چاہتے تھے۔ گو کہیں کہیں ان کا مقصد ان کے فن پر غالب آ گیا ہے لیکن اپنی قوتِ بیان اور خلوص کے سہارے حالی نے فن کی بعض کٹھن منزلیں بھی سر کی ہیں۔

اس کے ثبوت میں ان کی مثنویاں، قطعات اور مرثئے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مسدس کے علاوہ، مناجاتِ بیوہ، مجموعہ نظم حالی، دیوان حالی، ان کے مشہور مجموعے ہیں۔ حالی کا مطالعہ بہ حیثیت شاعر کرنے کے لیے، یادگار حالی (صالحہ عابد حسین)، حالی بہ حیثیت شاعر (شجاعت علی سندیلوی)، اردو شاعری پر ایک نظر (کلیم الدین احمد)، مسدس حالی (صدی اڈیشن) دیکھنا چاہیے۔

کچھ نظمیں

(۱) برکتِ اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اِک آزاد کہ ہے جن میں ملاپ
دولت و بخت ہے ہر حال میں ان کے دل خواہ

نہ انھیں حاجتِ اعوان نہ تلاشِ انصار
نہ انھیں خوفِ بد اندیش نہ بیمِ بدخواہ

پر نہیں رابطہ جس قوم میں اور یک جہتی
اس کی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت و جاہ

نہ ملاذ ان کے لئے قلعہ نہ خندق نہ فصیل
نہ مفید ان کے لئے فوج نہ لشکر نہ سپاہ

ایک مُلّا نے سُنا جب یہ سخن فرمایا

تکیہ اور اس قدر اسباب پہ کرنا ہے گناہ
اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں
دست قدرت کے ہیں سب ہاتھ سفید اور سیاہ
واں نہ ملت کی ضرورت ہے نہ کچھ تلوث کا ڈر
پہ لگی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ
کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دیتے ساتھ اگر
کر دیں افسر اور پراگندہ جماعت کو تباہ
پر مجھے خوب ہے اللہ کی عادت معلوم
اس کو جب دیکھا ہے دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

۲ - بے تمیزیٔ ابنائے زماں

از رہِ فخر اک نگینے سے یہ ہیرے نے کہا
جس جگہ ہیں ہم [illegible] قدر و قیمت تیری
ایک دھوکا ہو اگر الماس بن جائے تو کیا
مسکرا کر یہ نگینے نے یہ ہیرے سے کہا
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز

ہے وجود اے مبتذل تیرا برابر اور عدم
تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ کم ہونے کا غم
امتحاں کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم
گو کہ ہے رہبر ترا مجھ سے بڑا اے محترم
ہیں جوہری ایسے اس بازارِ پرساں میں کم

تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں
تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑتے ہیں ہم

۳۔ نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر
درگزر تھی اور نہ ساتھ ان کے رعایت تھی کہیں
بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی ان کی معاف
کام سے راحت کبھی ملتی نہ تھی ان کو کہیں
حسنِ خدمت پر اضافہ یا صلہ تو درکنار
ذکر کیا نکلے جو بھولے منہ سے اُس کے آفریں
پاتے تھے آقا کو وہ ہوتے تھے جب اس سے دوچار
تیوری چڑھی، منہ چڑھا، ماتھے پہ بل، ابرو پہ چیں
تھی نہ جز تنخواہ نوکر کے لئے کوئی فتوح
آکے ہو جاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے امیں
ہوتا تھا اک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس
فرض جن میں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعیں
گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار
زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انگبیں
حکم ہوتا تھا "شرائط نامہ" دکھلاؤ ہمیں
تاکہ یہ درخواست دیکھیں درج بھی ہے یا نہیں
واں سوا تنخواہ کے تھا جس کا آقا ذمہ دار

تھی گرہیں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمّہ تھیں
دیکھ کر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب
تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مارِ آستیں
ایک دن آقا تھا اک منہ زور گھوڑے پر سوار
تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ نازنیں
دفعتاً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار
اور گرا اسوار صدرِ زیں سے بالائے زمیں
کی بہت کوشش تو چھوٹی پاؤں سے لیکن رکاب
کی نظر سائیس کی جانب کہ ہو آکر معیں
تھا مگر سائیس ایسا سنگدل اور بے وفا
دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں
دور ہی سے تھا اُسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا
دیکھ لو سرکار اس میں شرط یہ لکھی نہیں

۴۔ حبِّ وطن

اے سپہرِ بریں کے سیّارو
اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا
اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری
اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھونکو
دہر نا پائیدار کے دھوکو

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رہنا
تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

تم مری دل لگی کے ساماں تھے
تم مرے دردِ دل کے درماں تھے

تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی
تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

آن اک اک تمہاری بھاتی تھی
جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی

کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری
دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری

جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے
ہو کے خوشحال گھر میں آتے تھے

بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب
دھو کے اٹھتے تھے دل کے داغ شتاب

کوہ و صحرا و آسمان و زمیں
سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں

پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار
جی ہوا تم سے خود بخود بیزار

نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے
نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے

سبزۂ گلشن ہے جی کا اک جنجال
شبِ مہتاب جان کو ہے وبال

کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا
جس طرف جائیں جی نہیں لگتا

کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں
تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں

ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور
یا تمہارے ہی کچھ بدل گئے طور

گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا
پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا

اے وطن اے مرے بہشتِ بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری سے ہے مورد آلام — تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے — گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا — ان کو کیا ہوگا زندگی کا مزا
ہوگیا یاں تو دو ہی دن میں حال — تجھ بن اک ایک پل ہے ایک اک سال
سچ ہے تو سبھی کو بھاتا ہے — یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار — یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں — اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
جن و انسان کی حیات ہے تو — مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہے نباتات کا نمو تجھ سے — روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما — سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا
تیری اک مٹھی خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

حملہ جب قوم آریہ نے کیا — اور بجا اُن کا ہند میں ڈنکا
ملک والے بہت سے کام آئے — جو بچے وہ غلام کہلائے
شودر کہلائے، راکشس کہلائے — رنج پردیس کے مگر نہ اٹھائے
گو غلامی کا لگ گیا دھبا — نہ چھٹا ان سے دیس پر نہ چھٹا

قدر اے دل وطن میں رہنے کی
پوچھیے پردیسیوں سے جی سے کوئی

جب ملا رام چندر کو بن باس
اور نکلا وطن سے ہو کے اداس

باپ کا حکم رکھ لیا سر پر
پر چلا ساتھ لے کے داغِ جگر

پاؤں اٹھتا تھا اس کا بن کی طرف
اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف

گزرے غربت میں اس قدر جو سال
پر نہ بھولا اجودھیا کا خیال

دیس کو بن میں بھی بھٹکتا رہا
دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا

تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا
آتی تھی جب اجودھیا کی ہوا

کٹنے چودہ برس ہی تھے محال
گویا اک اک جگ تھا ایک اک سال

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی
سید الابطحی کے ہمراہی

رشتے الفت کے سارے توڑ چلے
اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے

گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا
پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا

دل لگی کے ملے بہت سامان
پر نہ بھولے وطن کے ریگستان

دل میں آنکھوں پہ کھٹکتے تھے
کنکر پتھر زمینِ بطحیٰ کے

گھر جفاؤں سے جن کی چھوٹا تھا
دل سے رشتہ نہ ان کا ٹوٹا تھا

ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دور
اور ہوا ملکِ مصر پہ مامور

مصر پر جس کا تھا حکم رواں
آنکھ تھی جانبِ وطن نگراں

یادِ کنعاں جب اس کو آتی تھی
سلطنت ساری بھول جاتی تھی

اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند
اس سے خالی نہیں چرند و پرند

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں
سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں

جا کے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

آ کے کابل سے یاں بہی و انار
ہو نہیں سکتے بارور زنہار

مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
ہات دھوتی ہے زندگانی سے

آگ سے جب ہوا سمندر دور
اس کو جینے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں
جان کے لالے ان کی پڑتے ہیں

گائے یا بھینس اونٹ یا بکری
اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی

کہیے حبّ وطن انہی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر

عام مطالعہ کے لئے

ادبی مضامین

ASL-278 — Mathe fifth [5th] Primary [illegible]
(in Urdu) 1953 — 190 pages.

ASL-279 — Elements of Calculus
Sobi Chand, S P Arora, H L Gupta
Universal Publishing Company Delhi 1956
222 pages

ASL-280 Urdu Course [illegible] ([illegible])
Prof. Syed Ihtisham Husain Allahabad
J&K University (1968) — 208 pages

ASL-281 Qawaid-i-farsi [illegible]
156 pages (Persian Grammar in Urdu language)

دکن ہی میں ملتے ہیں۔

نثر کی پہلی کتاب "معراج العاشقین" بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب ہے۔ جن کا انتقال ۱۴۲۱ء میں گلبرگہ (دکن) میں ہوا کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اردو میں نظمیں بھی لکھیں جن کے متعلق ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد میراں جی شمس العشاق اور برہان الدین جانم نے متعدد مثنویاں تصنیف کیں۔ نظامی نامی شاعر نے ایک مثنوی لکھی جس کا نام "کدم راؤ پدم راؤ" تھا جلد ہی دکن میں شاعری کا بازار گرم ہو گیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بہمنی سلطنت ختم ہوئی اور اس کے پانچ ٹکڑے ہو گئے تو شعر و سخن کی سرپرستی کا زور اور زیادہ بڑھا۔ چنانچہ ریاستوں یعنی گولکنڈہ اور بیجاپور میں خود وہاں کے بادشاہوں نے شاعری کے لئے دکنی اردو کو منتخب کیا اور دکنی اردو میں لکھنے والوں کی سرپرستی کی۔ اسی زمانے میں گجرات کے علاقہ میں اردو زبان نے جڑ پکڑی اور کئی صوفی شاعر پیدا ہوئے جن کا کلام مطالعہ کے قابل ہے۔

گولکنڈہ کے مشہور بادشاہ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک) نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، نظم، ہر چیز کی طرف توجہ کی۔ اس کا کلیات شائع ہو چکا ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے کلام میں کیسی پرجستگی اور ہندوستانیت ہے اس کے دربار کا مشہور شاعر وجہی تھا جو نظم و نثر دونوں پر قدرت

غزل نے بھی عروج حاصل کیا۔ وہاں کی زبان شمالی ہند کی زبان سے کسی قدر مختلف تھی۔ لیکن اگر کوئی شخص غور سے اس شاعری کا مطالعہ کرے تو معلوم ہوگا کہ زبان اردو وہی ہے جسے دکن میں ترقی کرکے ادبی شکل اختیار کرنے کا موقع ملا۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا زمانہ تقریباً اورنگ زیب کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے اور ابتدائی شعراء میں شاہ ظہورالدین حاتم، صدرالدین فائز، شاہ مبارک آبرو، غلام مصطفیٰ یکرنگ، محمد شاکر ناجی وغیرہ کے نام ملتے ہیں جنھوں نے بالعموم غزلیں کہیں، کچھ مختصر مثنویاں، مرثیے اور نظمیں بھی لکھیں ان کی زبان سادہ، شیریں اور ہندی آمیز تھی۔ ابھی ان کا دور ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اردو کے ان عظیم المرتبت شعرا کا سلسلہ شروع ہو گیا جنھوں نے اردو شاعری کا مرتبہ بلند کیا۔ نام تو بہت سے ہیں لیکن ان میں خواجہ میر درد، مرزا محمد رفیع سودا اور میر تقی میر اپنا جواب آپ ہیں۔ میر درد نے صوفیانہ شاعری کو اس بلندی پر پہنچا دیا جہاں سے آگے پھر کوئی اردو شاعر بڑھ نہ سکا۔ سودا نے قصائد، ہجویات اور مرثیہ نگاری میں نام روشن کیا۔ خاص کر قصیدہ نگاری اور ہجو نگاری میں ان کا جواب پیدا نہ ہوا۔ میر نے غزل کی زمین پر قبضہ کر لیا اور خدائے سخن کہلائے۔ اگرچہ ان کی مثنویاں بھی درد و گداز، لطفِ بیان و طرزِ ادا کے لحاظ سے

اوّل درجہ کی تخلیقات ہیں، گویا اس عہد نے دہلی میں وہ صاحبان کمال جمع کر دیئے جن کے ہم پایہ پھر نہ پیدا ہو سکے ۔ اس عہد کے دوسرے نامور شعرا مرزا مظہر جان جاناں، یقین، سوز، قائم، تاباں اور مضمون ہیں، جن میں سے ہر ایک کی کچھ امتیازی خصوصیات ہیں اور جن کے ہاتھوں وہ عمارت کھڑی ہوئی جسے دلی اسکول یا دہلی کا دبستان شاعری کہا جاتا ہے ۔ اس کی تھوڑی بہت تفصیلات آگے آئیں گی ۔

یہ ایک کھلی ہوئی تاریخی حقیقت ہے کہ اٹھارویں صدی کے شروع ہوتے ہی مغل سلطنت کی بنیادیں کمزور ہو گئی تھیں ۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں نے رہی سہی قوت بھی ختم کر دی، اندرونی خلفشار اور سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں کے عروج نے اقتدار گھٹا دیا ۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کی منزل سے گزر کر حکومت کی منزل میں داخل ہو گئی ۔ ان باتوں کا نتیجہ کیا ہوا ؟ ہندوستان کی صنعت، تجارت اور زراعت کا زوال اور فوجی قوت کا زوال
اب اگر اس عہد کی شاعری میں ہم کو غم، افسردگی، بے دلی اور پسپائی کی جھلک ملتی ہے تو تعجب نہ کرنا چاہیے ۔ میر اور درد کی غزلوں میں تو خیر اس غم کی جھلک ملتی ہی ہے، سودا کی ہجویات تک میں اسی گہری افسردگی کی لہر نظر آتی ہے ۔ کبھی کبھی جو یہ کہا جاتا ہے

کہ شاعری اور زندگی میں ایک تعلق ہوتا ہے، شاعری زندگی کے نشاط و الم کی عکاسی کرتی ہے اور ماحول کی ترجمان بن جاتی ہے، اس کا یہی مطلب ہے۔

ابھی اٹھارویں صدی اپنی تین چوتھائیاں بھی طے نہیں کر چکی تھی کہ شاہ عالم بادشاہ دہلی، جو شاعر بھی تھے اور شاعروں کی سرپرستی کرتے نکلے، دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ایک طرح سے انگریز کمپنی کے وظیفہ خوار اور قیدی بن کر الہ آباد میں رہنے لگے۔ جو شعراء انھیں کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے وہ تو جیسر مایوس ہو ہی گئے، دوسرے لوگ بھی دہلی کو ایک ویرانہ تصور کرنے لگے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں 'اودھ' میں برائے نام مغلوں ہی کے ماتحت لیکن در حقیقت آزاد حکومت قائم ہو گئی تھی، اور خاص کر نواب شجاع الدولہ نے بڑے پیمانہ پر دربار داری شروع کی تھی۔ دہلی کے کئی شعراء جن میں فغاں، سودا، میر ضاحک سوز اور میر اہمیت رکھتے ہیں، تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اودھ چلے آئے اور یہاں ان کی عزت ہوئی۔ تاریخ ادب کے نقطۂ نظر سے یہ واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی وقت سے لکھنؤ میں بھی خاص طور سے شعر و ادب کا چرچا شروع ہوا۔ فغاں کچھ دن فیض آباد میں رہ کر پٹنہ چلے گئے۔ سوز آصف الدولہ کے استاد مقرر ہوئے لیکن جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ سودا آئے

معرکوں میں شریک ہوئے اور آصف الدولہ ہی کے عہد میں کوچ کر گئے۔ میر، سودا کے بعد پہنچے اور یہاں عزت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ میر ضاحک اپنے مشہور بیٹے میر حسن کے ساتھ آئے۔ سودا سے چوٹیں چلتی رہیں اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔ میر حسن نے کم عمر پائی لیکن اپنی مشہور مثنوی "سحر البیان" کی وجہ سے زندہ جاوید ہو گئے۔

جیسا کہ کہا گیا، اس طرح بہت سے علماء اور شعراء کے اودھ آجانے کی وجہ سے یہاں ادبی چہل پہل پیدا ہو گئی۔ مشاعرے ہونے لگے۔ معاصرانہ چشمکیں بڑھ گئیں۔ دربار سے وظائف پانے کی طرف توجہ ہوئی اور دوسرے شعراء نے بھی سرپرستی اور رونق دیکھ کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ چنانچہ ان آنے والوں میں غلام ہمدانی مصحفی، انشاء اللہ خاں انشاء اور یحییٰ امان جرأت اہمیت رکھتے ہیں ان میں سے ہر ایک شاعر کی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں اپنا مقام رکھتا ہے۔ علم و فضل کے لحاظ سے انشا کا شمار ہمیشہ ان لوگوں میں ہوگا جو شاعر سے کچھ زیادہ تھے۔ لیکن تاریخ ادب کا یہ عبرت انگیز پہلو ہے کہ ان حضرات کے آتے ہی لکھنؤ میں ادبی معرکے چھڑ گئے اور یہاں جو بیش و نشاط، نئے جوش اور نئی امنگ کی کیفیت پیدا ہوئی تھی اس نے شاعری میں بھی راہ پالی چنانچہ دہلی کے طرز کلام میں جو سنجیدگی، گہرائی، غم کوشی، بیدردگی، اور تاثیر تھی اس کی جگہ نشاط، سطحیت، معاملہ بندی۔ لفاظی اور

خارجیت کو پسند کیا جانے لگا۔ یہ فرق آگے چل کر اور بڑھا لیکن اس کی ابتدا اسی زمانہ میں ہو گئی تھی۔ بالکل ابتدا میں تو یہ فرق محض انداز بیان اور اختلاف محاورات تک محدود رہا۔ بعد میں موضوعات اور خیالات پر بھی اثر انداز ہوا۔ اسی اختلاف کو پیش نظر رکھ کر شاعری کی تاریخ میں اسے دبستان لکھنؤ کہا گیا ہے۔

دہلی اسکول کے مقابلہ میں لکھنؤ اسکول کا وجود میں آنا تاریخی اسباب کا نتیجہ تھا اور دنیا کے ہر ادب میں ایسے تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں جو فرق ہے اُسے بعض مورخوں اور نقادوں نے بہت ہی سطحی طریقہ پر پیش کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ فرق خصوصیات اور مقدار کا فرق تھا۔ بنیادی فرق نہیں تھا۔ شاعری میں یہ بنیادی فرق اس وقت ہوتا ہے جب زندگی میں کوئی بڑا تغیر واقع ہوتا ہے۔ یہاں صرف اتنا ہوا تھا کہ لکھنؤ میں ایک نیا دربار قائم ہوا تھا۔ نظام حکومت وہی تھا عوام وہی تھے، فلسفۂ زندگی وہی تھا، چھوٹے چھوٹے فرق تھے مثلاً لکھنؤ میں نسبتاً عیش تھا۔ زبان میں کچھ اختلافات تھے۔ مذہب اور خاص کر شیعہ مذہب اور عربی اور فارسی تعلیم کا زور تھا، اس لئے سوچنے کے طریقوں میں تھوڑا بہت فرق ہو گیا، بعض اصناف کی ترقی ہوئی، بعض کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی اس طرح رعایت لفظی کے استعمال میں بھی کمی اور بدیہاتی کا

فرق ہے۔ مضامین کے انتخابات میں بھی یہی صورت ہے بنیادی فرق نہیں ہے۔ پھر بھی اردو شاعری کے ہر طالب علم کو اس دور کا خاص طور سے مطالعہ کرنا اور اس ادبی فرق کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

انشاء، مصحفی، جرأت نے شاعری میں ایک نیا رنگ پیدا کیا، کچھ نئی راہیں نکلیں، لیکن شاعری میں وہ گہرائی اور خیالی انگیزی نہ رہی جو صوفیانہ اور سنجیدہ خیالات اور موضوعات سے پیدا ہوتی تھی۔ ابھی ان لوگوں کا عہد ختم بھی نہ ہوا تھا کہ لکھنؤ میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے نام سطح پر ابھرے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس فرق کو لکھنؤ اسکول کہا جاتا ہے اس کا بہت کچھ حق ناسخ کو پہنچتا ہے جنھوں نے لفاظی، رعایتِ لفظی، صحت الفاظ و محاورات، خارجی مضامین اور شعر کے تعمیری پہلوؤں پر اتنا زیادہ زور دیا کہ یہی باتیں شاعری قرار پائیں۔ فن پر قدرت کے لحاظ سے ناسخ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن تغزل اور لطفِ سخن کے نقطۂ نظر سے ان کی شاعری بہت ہی پھیکی اور بے اثر تھی۔ انھوں نے جذبات کی شدت کو لفاظی اور بناوٹ پر قربان کر دیا۔ آتش کا خمیر مختلف تھا۔ ان میں صوفیانہ گداز اور شاعرانہ وجدان تھا۔ انھوں نے رعایتِ لفظی اور لفاظی میں گرفتار ہوتے ہوئے بھی زندگی کے سمندر سے موتی نکال لئے اور

بڑے بانکپن اور بڑی بے نیاز سادگی سے اردو شاعری کے دامن میں ٹانک دئے۔ آتش کی شاعری، گرمی اور رنگینی، سوز اور عرفان کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لکھنؤ کے عوام بھی شاعری سے دلچسپی لے رہے تھے اور وہ وہاں کی تہذیبی زندگی کا جزو بن رہی تھی۔ ناسخ اور آتش کے شاگردوں نے اپنے استادوں کی پیروی میں زبان و بیان کی قیود کو اور زیادہ سطحی طور پر استعمال کیا لیکن چونکہ وہ اپنے استادوں سے کمتر درجے کے شاعر تھے، اس لئے انھیں یہ عظمت نہ حاصل ہو سکی۔ ناسخ کے شاگردوں میں رشک، وزیر، صبا اور آتش کے شاگردوں میں نسیم، رند اور خلیل نے اہمیت اختیار کی پھر ان شاگردوں کے شاگرد منظرِ عام پر آئے اور یہ رشتہ اس وقت تک کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ اس عہد میں شاعری کو موضوعات کے اعتبار سے تو کوئی خاص وسعت نہیں ملی، لیکن زبان کے اصول اور قواعد لغات اور محاورات پر کافی کام ہوا۔

لکھنؤ کا یہ حال تھا اور ادھر دلی، شاعری کے نقطۂ نظر سے اُجڑ جانے کے بعد پھر بس رہی تھی یعنی درد، سودا اور میر کی جگہ لینے والے پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ شیخ ابراہیم ذوق، حکیم مومن خاں مومن اور مرزا اسد اللہ خاں غالب ان بزرگوں کے رنگ سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ان کے سچے وارث اور جانشین کہے جا سکتے ہیں۔

یوں تو اس عہد میں شاہ نصیر، احسان، راقم، بہادر شاہ ظفر اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی غیر معمولی اہمیت اور شہرت رکھتے تھے لیکن ذوق، مومن اور غالب اس دور کے لئے باعث فخر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب چراغ بجھنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کی لو ایک بار زور سے بھڑکتی ہے۔ دہلی کی تباہی کے دن قریب تھے۔ مغل حکومت کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھنے والا تھا۔ اس کی آخری روشنی میں یہ صورتیں دکھائی دیں اور دہلی ایک مرتبہ پھر علماء اور شعراء کا مسکن بن گئی۔ اکبر اور جہانگیر کے دن واپس نہیں آسکتے تھے اس لئے اس آخری بہار کو محض اس قدیم روایت کا پرتو ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شعراء دہلی اسکول کی آبرو اور قلب و دماغ تھے جن کے سامنے اس روایت کے حسین ترین پہلوؤں کو پیش کر دینا تھا۔ ذوق اپنی درباری توسل کی وجہ سے قصیدہ گوئی کی حیثیت سے زیادہ چمکے، لیکن ان کی غزلوں میں بھی ایک کیفیت ہے۔ مومن نے غزل کو اس کے محدود عاشقانہ مفہوم میں برتا اور عشق و محبت کے نقش و نگار بنائے۔ ایک خاص انداز میں رعایت لفظی کا زور دہلی میں بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ شاہ نصیر کو تو اس نے ختم ہی کر دیا، ذوق بھی اس سے بچ نہ سکے۔ غالب پر اس کا جادو کام کر گیا اور مومن بری طرح اس کے اسیر ہو گئے۔ مومن عشق و محبت کی نفسیات گوناگوں طریقوں سے پیش کرتے ہیں

اور کبھی کبھی خیالات کی باریکی سے شاعری کو معمّہ بنا دیتے ہیں۔ مگر ہیں وہ اعلیٰ پایہ کے غزل گو۔ غالب نہ صرف اس عہد کے بلکہ پوری اردو شاعری کے نمائندے کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے یہاں فکر و فن کا حسین توازن، تصوف اور مادی تصورات، غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے جو انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ غزل کے تنگ دائرے میں انھوں نے اپنی رسائی فکر سے وسعت پیدا کی اور اظہارِ خیال کا وہ جادو استعمال میں لائے جو غزل کے بکھرے ہوئے حسن میں وزن و وقار کا اضافہ کرتا ہے ان کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے شعور نے وقت کی کشمکش کا احساس کیا اور انھوں نے زندگی کی اہم حقیقتوں کی طرف شاعرانہ اشارے کئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی مطالعہ کا محبوب موضوع ہیں۔

ابھی مغلیہ حکومت کا خاتمہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے بہت سے ٹکڑے الگ ہو کر خود مختار ہو گئے۔ کئی جگہ نئے دربار وجود میں آئے جہاں شعرا کی قدردانی ہوتی۔ لکھنؤ، حیدرآباد، پٹنہ، رام پور، فرخ آباد، ٹونک، الور، منگرول ان میں سے چند قابلِ ذکر مقامات ہیں۔ ان اہم شعرا کے شاگرد ان مقامات پر پھیلے اور شاعری کا بازار گرم رہا۔ لیکن اندر ہی اندر حالات کے بدل جانے کی وجہ سے ایک عظیم الشان انقلاب بھی ہو رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تمام قومی عناصر کو

دبا کر ایک طاقتور حریف بن چکی تھی۔ جتنے تصادم ہوئے تھے۔ ان سب میں کمپنی ہی کو قوت حاصل ہوئی تھی۔ آخری تصادم جو غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے موسوم ہے اس کا نتیجہ بھی یہی ہوا کہ انگریز براہ راست ہندوستان کے مالک ہو گئے اور ملک کا نقشہ بدل گیا۔ اس اہم تبدیلی کو بہت سے لوگوں نے اچھی طرح محسوس کیا، کچھ لوگ معمولی طور پر متاثر ہوئے اور کچھ سمجھ نہ سکے۔ یہی حال کم و بیش ادیبوں اور شاعروں کا تھا۔ جو کسی نہ کسی شکل میں درباروں سے وابستہ رہے، یا نئی زندگی کے تقاضوں سے دور رہے، ان کی لے زیادہ نہیں بدلی، جو براہ راست نئی زندگی کے زیر اثر آئے انھوں نے پرانی ڈگر چھوڑنا ضروری سمجھا۔ اول الذکر میں امیر، داغ، جلال اور تسلیم وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں، آخر الذکر میں حالی، آزاد، اسمٰعیل اور اکبر رہے۔ گویا یہ دورِ تغیر کا مکمل دور نہ تھا۔ ایک طرف پرانی آوازیں گونج رہی تھیں، دوسری طرف نئی نامانوس مگر وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ یہ تبدیلی عام سماجی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی تغیرات کا نتیجہ تھی جسے تاریخ نے جنم دیا تھا۔ اس دورِ جدید نے جس طرح نثر کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا تھا شاعری میں بھی تبدیلی پیدا کی بعض صنفوں کا زوال ہوا بعض کی شکل بدلی اور بعض کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے، یہ حالات کا مقابلہ کرتی رہی۔

دلی میں داغ اور لکھنؤ میں امیر مینائی نے اس کا علم بلند رکھا۔ پھر رام پور میں ان دونوں کی آمیزش بھی ہوئی۔ ناسخ کے سلسلے کے مشہور شاعر جلال نے دہلی کے رنگ کو اپنایا۔ بہار میں شاد عظیم آبادی نے مختلف رنگوں کو آمیز کر کے غزل میں نئی جان ڈالی اور ایسا محسوس ہوا کہ غزل ہی سب سے زیادہ اہم صنف سخن ہے۔ پھر داغ، امیر، اور جلال کے شاگردوں نے لکھنؤ اور دہلی کی روایات کو کسی حد تک قائم رکھتے ہوئے بھی دونوں کی حدوں کو توڑا۔ یہی نہیں بلکہ مختلف شہروں میں شعر و سخن کا چرچا ہوا۔ تنقید کا زور بڑھا اور جگہ جگہ اچھے شعرا پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ جلیل، حفیظ، ریاض، بے خود، سائل، نوح، حسرت موہانی، یگانہ، فانی، اصغر، جگر، صفی، چکبست، عزیز، محشر، ثاقب، آرزو، اثر، وغیرہ نے غزل کو غزل کی طرح لکھا۔ انھوں نے دورِ جدید کے بعض تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ قدیم روایات سے مکمل انحراف بھی نہیں کیا اور غزل کو زندگی کے مسائل سے قریب تر کیا۔ ان میں سے ہر شاعر اپنی خصوصیت رکھتا ہے لیکن ہر ایک یکساں طور پر مقبول نہیں۔ بعض شعرا نے صرف یہی نہیں کہ غزل کی روایت کو برقرار رکھا بلکہ اس میں اضافے بھی کیے۔

جب ہم موجودہ عہد کی غزل گوئی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں غزل کی دنیا وسیع تر ہوتی نظر آتی ہے۔ اقبال اور چکبست نے غزلوں میں زندگی کی کشمکش پیش کی تھی تو ان کے بعد آنے والوں نے

اسے نئے شعور کے ہیجان، خواب و خیال اور پیچیدہ طرزِ فکر کا ترجمان بنا دیا۔ اس کی جھلک ہمیں فراق گورکھپوری، فیض، جذبی، احمد ندیم قاسمی، حفیظ ہوشیارپوری، ناصر، مجروح، آل احمد سرور وغیرہ کی غزلوں میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کے رموز و کنایات، علامات و اشارات خصوص معنویت رکھتے ہیں اور غزل اپنی حدوں کے اندر افکار و خیالات کی ایک نئی دنیا آباد کر رہی ہے۔

اردو شاعری کے طالب علم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ گو غزل اردو شاعری کا قیمتی سرمایہ اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں اردو شاعری کی آبرو ہے لیکن وہ کل شاعری نہیں ہے بعض اور اصناف میں بھی اردو شاعری پھلتی نظر آنے لگتی ہے جسے نظر انداز کر دینے سے شاعری کی مکمل تصویر نہیں بنتی۔ غزل کے علاوہ مثنوی مرثیہ، قصیدہ، ہجو، ریختی، قطعات، رباعیات، فلسفیانہ بیانیہ، منظری نظمیں بھی بڑی تعداد میں ملتی ہیں اور اپنی رنگارنگی تنوع اور دلکشی سے حیرت میں ڈالتی ہیں۔ ان تمام اصناف کی اپنی تاریخ ہے۔ ان کے ارتقاء کی ایک کہانی ہے جو تفصیل سے بیان کئے جانے کی محتاج ہے۔ جیسا کہ ہر ادب میں ہوتا ہے۔ بعض اصناف کو بعض کے مقابلے میں اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ بعض کو کسی خاص دور میں ترقی کرنے کا موقع ملتا ہے، بعض مسلسل ذہنی کاوش کا مرقع بنے رہتے ہیں اسلئے ہر ایک کا

ذکر یہاں تفصیل سے نہیں کیا جا سکتا تاہم مختصراً چند اہم اصناف
کے ارتقا کا تعارف مفید ہوگا۔

اردو مثنوی کی تاریخ بہت طویل ہے۔ فارسی کے اثر سے مثنویاں
بہت پہلے لکھی جانے لگیں۔ دکن اور گجرات میں سولہویں صدی
میں بعض اہم مذہبی اور صوفیانہ مثنویاں لکھی گئیں، جیسے خوب محمد چشتی
کی "خوب ترنگ"۔ میراں جی کی "خوش نغز" "خوش نامہ" وغیرہ۔ پھر
طویل افسانوی مثنویوں کا دور آیا اور وجہی نے "قطب مشتری"،
غواصی نے "سیف الملوک و بدیع الجمال"۔ ابن نشاطی نے "پھول بن"
نصرتی نے "گلشنِ عشق" اور "علی نامہ"، رستمی نے "خاور نامہ"
ہاشمی نے "یوسف زلیخا" لکھیں۔ یہ ساری مثنویاں اعلیٰ پایہ کی ہیں۔
اٹھارویں صدی میں دکن ہی میں بحری نے "من لگن" اور سراج نے
"بوستانِ خیال" نامی مثنویاں تصنیف کیں جن کا پایہ بہت بلند ہے۔
شمالی ہند میں چند مختصر مثنویوں کے بعد میر نے چھوٹی بڑی متعدد
مثنویاں لکھیں جن میں "دریائے عشق" اور "شعلۂ عشق" بہت
اہم ہیں۔ ان میں جذبات نگاری اور بیانیہ دونوں کا لطف
ہے۔ میر حسن کی "سحر البیان" نے دوسری تمام مثنویوں کو ماند کر دیا۔
اسی عہد میں اثر دہلوی نے "خواب و خیال" لکھی جس کے بعض حصے
بہت ہی دلکش ہیں۔ لکھنؤ میں ایک اہم مثنوی دیا شنکر نسیم نے
"گلزارِ نسیم" کے نام سے لکھی جو رعایت لفظی سے بھری ہوئی ہونے

کے باوجود روانی اور لطف کی حامل ہے۔ بعد کی مثنویوں میں شوقؔ کی "گلزارِ نسیم" اور شوقؔ کی "زہرِ عشق" نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ مومنؔ نے بھی چند قابلِ مطالعہ عشقیہ مثنویاں لکھیں۔ منیرؔ شکوہ آبادی کی "معراج المضامین" اور واجد علی شاہ اخترؔ کی "حزنِ اختر" اور "افسانۂ عشق" قابلِ مطالعہ ہیں۔ دورِ جدید میں مثنویوں کا رنگ بدلا۔ حالیؔ، آزادؔ اور شبلیؔ نے نئے موضوعات پر مثنویوں کے انداز میں طویل نظمیں لکھیں۔ ان کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ احمد علی شوقؔ، محسن کاکوروی، بینظیر شاہ اور ان کے بعد اقبالؔ، حفیظؔ اور جوشؔ کی بعض مثنوی نما نظمیں اہمیت رکھتی ہیں۔

قصیدہ گوئی کو ایک زمانہ میں کمالِ فن سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ درباروں میں مقابلہ کے لئے یہ ایک مناسب صنف تھی۔ مگر اردو میں فارسی کی طرح قصیدہ کی ترقی نہ ہو سکی پھر بھی بعض قصیدہ نگاروں نے اس صنف کو بھی آسمان تک پہنچا دیا۔ دکن میں نصرتیؔ کے قصائد کے علاوہ شروع میں اور قابلِ ذکر قصائد نہیں ملتے۔ شمالی ہند میں سوداؔ نے قصیدے کی طرف توجہ کی اور اپنے پرشکوہ اندازِ بیان، قدرتِ کلام اور عالمانہ اندازِ نظر سے سب سے بلند مرتبہ حاصل کر لیا۔ پھر قابلِ ذکر نام ذوقؔ کا ہے جن کے قصیدے سوداؔ سے گر گئے ہیں۔ لیکن جیسا جوش اور زورِ بیان سوداؔ کے یہاں ملتا ہے ذوقؔ کے قصائد میں نظر نہیں آتا۔ غالبؔ نے غزلوں کی طرح قصیدہ

نگاری میں بھی اپنا الگ رنگ رکھا لیکن ان کے فارسی قصائد نے اہمیت حاصل کی کہ اردو قصائد پیچھے چھوٹ گئے۔ لکھنؤ کے آخری دور میں منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، جلال اور تسلیم وغیرہ کے قصائد اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ قصائد درباری زندگی سے وابستہ تھے اس لئے درباروں کے خاتمہ کے ساتھ ان کا زوال ہو گیا۔ ہاں مذہبی عقائد کی بنا پر قصیدہ نگاری جاری رہی چنانچہ محسن کاکوروی، صفی، عزیز، محشر، نجم آفندی اور جمیل مظہری نے قصیدے میں ندرت پیدا کر کے اسے عصر حاضر کے مذاق سے ہم آہنگ بنا دیا۔ قدما نے ہجو کو بھی قصیدے کا ایک روپ شمار کیا ہے لیکن یہ مناسب نہیں۔ قصیدے اپنی ہیئت کے لحاظ سے بیشتر ایک معین شکل میں غزل کی طرح لکھے گئے لیکن ہجویں ہر انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ہجو نگاری کی تاریخ جعفر زٹلی سے شروع کی جا سکتی ہے لیکن اس میں سب سے بڑا نام سودا کا ہے۔ کچھ ہجویں میر، انشا اور مصحفی کی بھی قابل مطالعہ ہیں۔ انہیں ہجووں نے مزاحیہ شاعری اور طنز نگاری کی شکل اختیار کی جس میں اکبر اور ظریف نے نام روشن کیا۔

مرثیہ ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ اردو میں اس کی ابتدا بھی دکن ہی سے ہوئی اور وہاں سینکڑوں شعرا نے مرثیے لکھے لیکن وہ مرثیے ادبیت نہیں رکھتے تھے محض عقیدت کا اظہار

کہا کرتے تھے۔ دہلی میں شاعری کا رواج ہوتے ہی مرثیہ کی طرف توجہ کی گئی۔ اور ننانوے فیصدی مرثئے واقعۂ کربلا سے متعلق لکھے گئے۔ سب سے پہلے جس نے مرثیہ کو ادب کا درجہ دیا وہ سوداؔ تھے۔ ان کے مرثیہ کا مکمل دیوان موجود ہے جو نہ صرف مضامین بلکہ ندرتِ ادا اور اندازِ بیان کے لحاظ سے بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ ان کے علاوہ مسکینؔ، گداؔ، افسردہؔ وغیرہ نے اس صنعت کو ترقی دی۔ مرثیہ کی اصل ترقی اودھ میں ہوئی جہاں شاہانِ اودھ کی مذہبیت اور فیاضی نے اسے ابھرنے کا موقع دیا۔ میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ کے مراثی دیکھ کر اس کی زبردست ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بحر انھیں کے ہم عصر میاں دلگیرؔ اور مرزا فصیحؔ نے اس رنگ کو چمکایا، مگر اسے جس منزل پر میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے پہنچا دیا وہ حیرت خیز ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر مرثیہ محض واقعۂ کربلا کا غم انگیز بیان نہ رہا بلکہ ایک مخصوص قسم کی نظم بن گیا۔ جس نے کردار نگاری، منظر نگاری، رزم نگاری، اخلاقی مسائل اور مضامین درد کے لحاظ سے بلند پایہ ادب کی شکل اختیار کر لی۔ ان کے بعد انسؔ، مونسؔ، نفیسؔ، سلیسؔ، جلیسؔ، وحیدؔ، عارفؔ، رشیدؔ، تعشقؔ، عشقؔ، عروجؔ، اوجؔ، جاویدؔ، رفیعؔ وغیرہ نے اس روایت کو شان کے ساتھ جاری رکھا۔ واقعۂ کربلا کے علاوہ جو مرثئے لکھے گئے ہیں ان میں غالبؔ، حالیؔ، چکبستؔ اور اقبالؔ کے لکھے ہوئے مرثیوں کو اہمیت حاصل ہے۔ اس فن بھی

بہت سے مرثیہ نگار موجود ہیں جو واقعۂ کربلا پر نظمیں لکھ رہے ہیں۔ بعض قدیم روایات کے مطابق لکھتے ہیں اور بعض جدید انداز میں۔ ظاہر ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں اس صنف کے انداز میں بھی تبدیلی کا ہونا لازمی ہے۔

قطعات اور رباعیات کی کوئی اہم تاریخ نہیں ہے، یہ اصناف بھی فارسی ہی کے زیر اثر اردو میں آئیں اور ہر عہد میں شعرا ان کی طرف متوجہ رہے۔ قطعات کبھی کبھی غزلوں کے درمیان جگہ پاتے رہے کبھی الگ مختصر نظموں کی شکل میں لکھے گئے۔ کوئی ایسا شاعر نہیں ہے جس نے محض قطعات لکھے ہوں۔ ہاں دورِ جدید میں بعض شعرا نے اس پر خاص توجہ کی ہے۔ یہی حال رباعیوں کا ہے تقریباً سبھی شعرا کے دیوانوں میں کچھ رباعیاں مل جاتی ہیں لیکن کچھ شاعر خاص طور سے اس کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ موجودہ عہد میں اس صنف کی جانب خاص توجہ کی جا رہی ہے اور بعض فلسفیانہ، فکری اور اخلاقی حقائق اس سانچے میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

موجودہ دور میں جس صنفِ سخن کو خاص طور سے ترقی حاصل ہوئی ہے اور اہمیت دی گئی ہے وہ جدید منظومات ہیں۔ اردو ادب میں نظم کا لفظ دو الگ الگ معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ عام حیثیت تو یہ ہے کہ ہر شاعرانہ تخلیق کو نظم کہہ سکتے ہیں چاہے وہ

مختصر ہو یا طویل۔ یہ بھی شرط نہیں کہ وہ کسی خاص شکل میں ہو۔ اپنے دوسرے مفہوم میں لفظ نظم ایک مسلسل، مربوط اور ارتقائی شاعرانہ تصنیف کے لئے استعمال ہوتا ہے اور چند اصناف جو مشہور و معروف ہیں جیسے غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ ان کے علاوہ دوسری شاعرانہ تخلیقات نظم کہلاتی ہیں۔ ان کی طرف دورِ جدید میں توجہ کی گئی ہے۔ لیکن اس کی ابتدا دکن ہی میں ہو چکی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے متعدد نظمیں لکھیں جو ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ ان کے موضوعات عاشقانہ، بیانیہ، واقعاتی اور منظری ہیں۔ دلی کے ابتدائی دور میں فائز اور حاتم کے یہاں نظمیں ملتی ہیں۔ لیکن واقعی جس شاعر نے اردو کو نظموں سے مالا مال کر دیا وہ نظیر اکبر آبادی ہیں۔ ان کا عہد اٹھارویں صدی کا آخری اور انیسویں صدی کے ابتدائی تیس سال ہیں۔ انھوں نے زندگی کے تقریباً سبھی پہلوؤں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور نہ صرف زبان کی حدیں وسیع کیں بلکہ شاعری کو عام زندگی سے قریب تر کر دیا۔ اس کے علاوہ مرثیوں کے بعض حصوں کو بھی ہم نظم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ غالب اور ذوق کی بعض غزلیں اپنے تسلسل اور انداز بیان کے لحاظ سے اس مفہوم میں نظمیں ہیں۔

نظموں کی اصلی ترقی عصر جدید میں ہوئی۔ اس کے ابتدائی معمار اور رہنما آزاد اور حالی تھے۔ ان بزرگوں نے عصر حاضر کے تقاضوں

کو سمجھا، شاعری کی مقصدیت کا اعتراف کیا۔ اُس کو قومی ترقی کا آلۂ کار قرار دیا اور مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۸۶۷ء میں لاہور میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی۔

تھوڑے دنوں کے بعد مولانا حالی بھی اس میں شریک ہو گئے سرسید کی ہمہ گیر تحریک نے جو نئے تصورات پیدا کئے تھے انھوں نے اسے ہوا دی اور کچھ دنوں کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ نظموں نے غزل کی جگہ لے لی ہے۔ آزاد کا مجموعہ "نظم آزاد" کی شکل میں اور مولانا حالی کی نظموں کے مجموعے ہمارے سامنے ہیں اور ہم بڑی آسانی سے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ دونوں بزرگ کس طرح اردو شاعری کو رسم پرستی اور روایتی انداز نظر سے بچانا چاہتے تھے۔ اس عہد میں نذیر احمد، شبلی، ذکاء اللہ، اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی نے بھی نظمیں لکھیں۔ اکبر نے ظرافت اور مزاح کے پردے میں زندگی کے اہم حقائق پیش کئے۔ شبلی نے سیاسی مسائل کی جانب توجہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظم نگاری اظہار حقائق کا سب سے مؤثر ذریعہ قرار پا گئی۔

آزاد، حالی اور شبلی کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر چکبست اور اقبال نے اونچے محل تعمیر کر دیئے۔ چکبست کے موضوعات محدود تھے۔ حب الوطنی، قومی اتحاد، کشمیریوں کی قومی آزادی کے لئے جد و جہد یہی ان کے موضوعات تھے جو کبھی نوحوں اور مرثیوں

کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ کبھی دوسری نظموں کی شکل میں اقبال کے ہاتھوں اردو شاعری حیات و کائنات کے مسائل سے بھر گئی۔ ان کے موضوعات وسیع تھے، نقطۂ نظر فلسفیانہ تھا اور پیام، گرمیٔ محبت کا امین تھا۔ اسی عہد میں مولانا صفی، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، شاد، برق، عظمت اللہ خاں، سیماب اکبر آبادی، تلوک چند محروم نے اہمیت حاصل کی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات اور زیادہ بدلے۔ سیاسی شعور بڑھا، آزادی کا جذبہ تیز ہوا اور زندگی کے عام مسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس کی عکاسی جوش ملیح آبادی ساغر، حفیظ، اختر شیرانی کے یہاں ہوئی۔ ان میں جوش اس دور کے نمائندہ کہے جا سکتے ہیں۔ مگر جب ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین بنی اور شاعری میں ایک خاص قسم کی سماجی حقیقت نگاری کا مطالبہ کیا جانے لگا تو وہ شعراء جو پہلے محض رومانی تصورات کو اہمیت دیتے تھے، سماجی اور سیاسی مسائل کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ یہ شعور فراق، جوش، روش، احسان، دانش، ساغر وغیرہ کے یہاں نمایاں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ بعض شعراء کی اصلی شہرت اسی عہد سے شروع ہوئی۔ ان میں فیض، مجاز، سردار جعفری، جاں نثار اختر، اختر انصاری، جذبی، آنند نرائن ملا، کیفی اعظمی، مجروح، ساحر، احمد ندیم قاسمی نہ صرف

اہم ہیں بلکہ تاریخ ادب میں اپنی جگہ رکھتے ہیں۔

ادھر تو یہ اثرات پھیل رہے تھے، دوسری جانب کچھ شعرا ہیئتی فنی تجربے کر رہے تھے۔ ان میں تصدق حسین خالد، ن۔م۔ راشد، میراجی، سلام مچھلی شہری خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا نے آزاد نظموں میں کامیاب اور ناکامیاب تجربے کئے اور اگرچہ انھیں عام طور پر مقبولیت حاصل نہ ہوسکی، لیکن اردو شاعری کا نقاد انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اس مختصر سے خاکہ کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری ہمیشہ انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کی عکاسی اور ترجمانی میں پیش پیش رہی ہے۔ اس کا پیام انسان دوستی، امن و اتحاد آزادی اور ترقی کا پیام رہا ہے۔ یہ شاعری لکیر کی فقیر بھی نہیں رہی ہے بلکہ تجربوں سے لطف لیتی، انھیں اپنے دامن میں جگہ دیتی چھوڑتی اور آغوش میں لیتی رہی ہے۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ اس میں عیوب نہیں ہیں یا وہ مکمل ہو چکی ہے۔ ایسا تو دنیا کے کسی ادب کے متعلق نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگی ہوئی ہے۔

اُردو ادب

(نثر)

اُردو نظم و نثر کے ایسے نمونے، جنہیں ادبی بھی کہہ سکیں، ہمیں پندرہویں صدی عیسوی میں ملنا شروع ہو جاتے ہیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نثر کا اصلی ارتقا شاعری کے مقابلہ میں بعد میں ہوا۔ جب اردو زبان دکن میں پھیلی اور وہاں شمالی ہند سے عالم، صوفی تاجر، فوجی، سرکاری عمال پہنچے اور آباد ہو گئے تو کچھ ہی دنوں کے اندر اس زبان میں ادبی کارنامے نظر آنے لگے۔ اگرچہ سرکاری طور پر وہاں بھی شمالی ہند کی طرح فارسی کا رواج تھا لیکن عام بول چال کی زبان کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا چنانچہ صوفی فقراء جو اپنے خیالات عام لوگوں میں پھیلانا چاہتے تھے اس زبان کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز کا ملتا ہے جنھوں نے دکنی اردو میں اپنی کتاب "معراج العاشقین" لکھی۔ یہی اس وقت اردو نثر کی پہلی تصنیف سمجھی جاتی ہے بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس سے بھی کچھ پہلے مشہور صوفی سید مخدوم

اشرف جہانگیر (کچھوچھہ شریف) نے ایک رسالہ تصوف و اخلاق کے متعلق لکھا تھا۔ لیکن چونکہ وہ رسالہ نہ تو دستیاب ہوا ہے اور نہ اس کے متعلق کچھ زیادہ معلوم ہے اس لئے ابھی تک معراج العاشقین ہی کو پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۴۲۱ء کے پہلے لکھا گیا ہوگا کیونکہ اسی سال سید گیسو دراز کا انتقال ہوا۔ اس کی زبان مشکل اور مطالب گہرے ہیں اور ہر شخص اسے آسانی سے سمجھ نہیں سکتا۔ اسی طرح سولہویں اور سترہویں صدی میں شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے فرزند برہان الدین جانم اور بعض دوسرے بزرگوں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے اس پرانی دکنی اردو میں اپنے کارنامے چھوڑے ہیں ان کتابوں کی اہمیت مذہبی اور لسانی زیادہ ہے ادبی کم کیونکہ یہ بزرگ یہ کتابیں ادبی خدمت کے لئے نہیں مذہبی اور روحانی جذبے کی تکمیل کے لئے لکھتے تھے۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ابھی زبان ادبی کارناموں کے قابل بھی نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد جب دکن میں کئی سلطنتیں قائم ہوگئیں اور اُن میں بیجاپور اور گولکنڈہ کے عادل شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں نے اردو کی سرپرستی شروع کردی تو اس کی اور ترقی ہوئی اور مذہبی ادب کے علاوہ دوسری طرح کی چیزیں بھی لکھی جانے لگیں دکن کے مشہور شاعر ملا وجہی جو گولکنڈہ کے رہنے والے تھے نثر کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور ۱۶۳۵ء میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب

"سب رس" لکھی، جس میں اخلاقی اور صوفیانہ مسائل ایک تمثیلی قصہ کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی زبان مقفیٰ ہے لیکن جو شخص دکنی اردو کی خصوصیات سے واقف ہے، وہ اس کی روانی اور سلاست پر حیرت زدہ رہ جائے گا۔ دکنی اردو میں نثر کی بعض اور کتابوں کے نام ملتے ہیں لیکن وہ بہت اہم نہیں ہیں۔ ہاں اٹھارہویں صدی میں سید محمد قادری نے "طوطی نامہ" مرتب کیا جس میں "پنج تنتر" اور "ہتوپدیش" کی کہانیاں فارسی سے اردو میں منتقل کی گئیں۔

دکن کے بعد جب ہم شمالی ہند کے نثری ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں کچھ نثری عبارتیں میر جعفر زٹلی کے کلیات میں ملتی ہیں لیکن پہلا اہم نام فضلی کا ہے جنھوں نے "دہ مجلس" یا "کربل کتھا" کے نام سے ایک فارسی تصنیف کی بنیاد پر ایک کتاب لکھی۔ اب یہ کتاب شائع ہو گئی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ فضلی کو نثر لکھنے پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اس کے بعد ۱۷۸۰ء کے قریب میر حسین عطا خاں تحسین کی "نو طرز مرصع" ملتی ہے۔ اس کی اہمیت اردو نثر کی تاریخ میں مسلم ہے کیونکہ اسے ہم نثر کا پہلا خالص ادبی کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ فارسی کے قصہ "چہار درویش" پر مبنی ہے اور بے حد رنگین، مقفیٰ اور مسجع نثر میں اسے پیش کیا گیا ہے۔ اسی زمانے میں مرزا سودا نے میر کی ایک مثنوی بھی نثر میں منتقل کی مگر یہ دستیاب نہیں ہوتی۔ مولانا محمد رفیع الدین اور مولانا عبدالقادر

سے قرآن شریف کے ترجمے بھی کئے گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اردو میں لوگ ہر طرح کی چیزیں پڑھنے پر مائل تھے۔

ابھی انیسویں صدی کی ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی کہ اُردو زبان ہندوستان کے اکثر حصوں میں عام ہو گئی اور انگریز جنھوں نے ملک کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، اس زبان کو ملک کی مشترکہ زبان سمجھنے لگے۔ انھوں نے اسے سیکھنے کی ضرورت محسوس کی اور اگرچہ ایک آدھ انگریز عالم اس سے کافی واقفیت رکھتے تھے لیکن کاروبار کے لئے زیادہ لوگوں کا اس سے واقف ہونا ضروری معلوم ہوتا تھا۔ اس خیال سے ۱۸۰۰ء میں ایک کالج "فورٹ ولیم کالج" کے نام سے کلکتہ میں قائم کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو اردو کے بڑے عالم تھے وہاں اردو کی تعلیم اور ترقی کے نگراں مقرر ہوئے۔ چونکہ پڑھانے کے لئے اچھی کتابیں نہیں ملتی تھیں اس لئے کتابیں لکھوانے کا ایک شعبہ بھی قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی نگرانی میں یہ محکمہ کام کرنے لگا اور دس بارہ سال کے اندر بہت سی کتابیں وجود میں آ گئیں۔ یہاں لکھی جانے والی کتابوں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ سادہ اور آسان زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ شروع میں بہت سے لوگوں کو ان کتابوں سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ یہ عام لوگوں تک نہیں پہنچیں، لیکن ان سے اردو ادب کو جو فائدہ پہنچا

اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ان لکھنے والوں میں سب یکساں مشہور نہیں اور نہ ساری کتابیں یکساں اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض زندہ جاوید ہو گئی ہیں۔ یہیں میر امن دہلوی نے "باغ و بہار" لکھی جو اردو کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے۔ اس کے ترجمے ہندی اور انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں بھی قصہ "چہار درویش" کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی زبان دہلی کی بول چال کی زبان ہے۔ اس میں محاورات اور روزمرہ کا استعمال ایسے حسن سے کیا گیا ہے کہ کتاب ترجمے کے بجائے طبعزاد معلوم ہوتی ہے۔ یہیں حیدر بخش حیدری نے بھی کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں حاتم طائی کا قصہ "آرائش محفل" سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ہوا۔ میر شیر علی افسوس نے بھی "آرائش محفل" لکھی جس میں ہندوستان کے متعلق دلچسپ انداز میں بہت سی تاریخی اور جغرافیائی معلومات اکٹھا کر دیں۔ کاظم علی جوان نے کالیداس کے مشہور شکنتلا ناٹک کو اردو قصہ کی شکل میں منتقل کیا۔ انھوں نے "سنگھاسن بتیسی" کو بھی اردو کا جامہ پہنایا۔ نہال چند لاہوری نے گل بکاؤلی کا قصہ نثر میں "مذہب عشق" کے نام سے لکھا۔ مظہر علی ولا نے "بیتال پچیسی" اردو میں لکھی۔ اشک نے داستان امیر حمزہ ترتیب دی۔ کئی اور لکھنے والوں نے

متعدد کتابیں لکھیں اور پرانی کتابوں کے نئے اڈیشن شائع ہوئے اس کالج کے زیرِ اہتمام ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی کتابیں لکھوائی گئیں۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے عام خیال ہے کہ جدید ہندی یا ادبی ہندی کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ یہ وہی ہندی ہے جو اردو سے مشابہ ہے اور اسی طرح کھڑی بولی پر بنی ہے جیسے اردو۔ بہت سے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ یہیں سے ہندی اردو کا جھگڑا شروع ہوا۔ اور ہندی اور اردو الگ الگ زبانیں قرار دی گئیں۔

اس کالج کے باہر بھی ادبی کام جاری رہا۔ مشہور تصانیف میں انشاء اللہ خاں انشا کی دو کتابیں ہیں "رانی کیتکی اور کنور اُدے بھان کی کہانی" اور "سلک گہر"۔ پہلی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں عربی فارسی کے لفظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ دوسری کتاب میں کوئی نقطہ دار لفظ کام میں نہیں لایا گیا ہے۔ پہلی کتاب ادبی حیثیت سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے علاوہ انشاء نے اپنی ایک فارسی کتاب "دریائے لطافت" میں اردو نثر کے بہت سے نمونے اکٹھا کر دئے جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۸۲۴ء میں لکھنؤ میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھی۔ انھوں نے اور کئی کتابیں بھی لکھیں لیکن جو شہرت "فسانۂ عجائب" کو نصیب ہوئی وہ اردو کی چند ہی کتابوں کو نصیب ہوئی

ہے۔ یہ ایک دلچسپ مافوق الفطرت قصہ ہے جس میں جادو، طلسم، دیو پری سب آتے ہیں، لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے اودھ کی تہذیبی زندگی نگاہوں کے سامنے متشکل ہو جاتی ہے۔ سرور کی نثر مقفیٰ اور مسجع نثر کا بہترین نمونہ کہی جا سکتی ہے۔

۱۸۴۲ء کے قریب دہلی کالج میں ایک ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی۔ جس نے سیکڑوں کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا۔ ان کتابوں میں سائنس، ہیئت، جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ، سیاست ریاضی ہر موضوع کی کتابیں شامل ہیں۔ عیسائی مبلغین نے انجیل اور بعض دوسری مذہبی کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں کیے۔ اس طرح اردو کا دامن طرح طرح کے پھولوں سے بھرتا رہا۔

اس زمانہ میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ مرزا غالب نے اردو نثر کی طرف توجہ کی اور اگرچہ انھوں نے زیادہ تر خطوط ہی لکھے، لیکن ان خطوط میں ایسا رنگین، شگفتہ، مفید اور خوبصورت ادبی سرمایہ جمع ہو گیا جس پر اردو ادب ناز کر سکتا ہے۔ ان خطوں میں غالب کی زندگی، شخصیت اور اس عہد کی ادبی، تاریخی اور سماجی حالت کی ایسی تصویر کشی ہو گئی ہے کہ یہ خط اہم دستاویز بن گئے ہیں اس عہد کے اور دوسرے لکھنے والوں میں مولانا امام بخش صہبائی، غلام غوث بے خبر اور غلام امام شہید مشہور ہیں۔

اس مختصر بیان سے اندازہ ہوا ہوگا کہ انیسویں صدی کے

وسطیٰ تک اردو نثر کی تاریخ میں بھی قابل لحاظ سرمایہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ لیکن اس وقت ہندوستان کی قومی، سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی میں جو تبدیلیاں ہوئیں، انھوں نے یہاں کی ادبی زندگی کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ انھیں تبدیلیوں کو دورِ جدید کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہوا تو یہاں انگریزی حکومت باقاعدہ طور پر مستحکم ہو گئی۔ سیاسی، تعلیمی اور معاشی انتظام ایسا بدلا کہ یہاں کے مسائل اور یہاں کے لوگوں کے ذہن بدل گئے اور تبدیلی کی جو ضرورت محسوس ہوئی اس کا اثر اردو نثر پر گہرا پڑا۔ ۱۸۳۵ء میں اردو دفتری زبان بن گئی تھی، پریس قائم ہو گئے تھے، اخبارات نکلنے لگے تھے اور کتابیں شائع ہونے لگی تھیں۔ نئی تعلیم اور زندگی کی نئی ضروریات نے زبان کو ایک سماجی آلہ بنا دیا اور اب جو ادب ہمارے سامنے آتا ہے وہ سماجی ضروریات کے پورا کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے۔

دورِ جدید میں ہمارے سامنے وہ نام آتے ہیں جو زندۂ جاوید ہیں۔ سرسید، آزاد، حالی، نذیر احمد، شبلی، سرشار، شرر، محسن الملک، ذکاء اللہ، اسمٰعیل میرٹھی یہ چند نام ہیں جن کے کارناموں پر کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کے کارناموں نے ان کے نام اور خود اردو ادب کے صفحات روشن کر دئے ہیں۔ ان لوگوں نے وقت کی آواز پر کان دیا، اس کے تقاضوں کو سمجھا اور ادب کو

اس سانچے میں ڈھال دیا جس کے لئے فضا تیار ہو رہی تھی چونکہ ہندوستانی سماج کا ارتقا یکساں نہیں ہو رہا تھا۔ ترقی اور نئے پن کے ساتھ جمود اور قدامت کے اثرات بھی تھے اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قدیم روایتیں ختم ہو گئیں نظم میں یہ بات نثر کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں ہے۔ نثر عہد جدید کے تقاضوں کی آئینہ داری زیادہ کر رہی تھی کیونکہ زندگی کی عام کشمکش کا اظہار نظم کے مقابلہ میں نثر میں زیادہ ہوتا ہے۔

چونکہ ان تمام لکھنے والوں میں سرسید ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ اس لئے کبھی کبھی یہ دور "عہد سرسید" کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ چونکہ اس عہد میں اردو نثر کی غیر معمولی ترقی ہوئی اس لئے اسے اردو نثر کا "عہد زریں" بھی کہتے ہیں۔ اسی عہد میں نثر کے مختلف اصناف کی ابتدا ہوئی۔ سوانح عمری، تنقید، ناول، انشا، تاریخ ہر صنف میں کتابیں لکھی گئیں اور ادب کا دائرہ بے حد وسیع ہو گیا۔

سرسید احمد خاں ایک جامع الصفات شخص تھے۔ ادبی کام ان کی زندگی کا صرف ایک پہلو تھا اور وہ بھی ان کے دوسرے کاموں سے تعلق رکھتا تھا۔ انھوں نے مذہبی مسائل پر لکھا تو اس لئے کہ اس سے وہ اصلاح کے اس کام کو آگے بڑھانا چاہتے تھے جو انھیں عزیز تھا اور جسے وہ قومی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ مضامین اس لئے لکھے کہ ان سے ان کا تعلیمی، معاشرتی اور ادبی مشن پورا ہوتا تھا۔

بہرحال سرسید ایک انتھک اور ہوشمند مصلح قوم تھے اور ادب کی اصلاح بھی ان کے کام کا ایک جزو تھی۔ انھیں جدید اردو کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ وہ صاف، سادہ، پُرزور اور پُراثر نثر لکھتے تھے اور اپنا مطلب اس طرح ادا کرتے تھے جو اس کا حق تھا ان کی کتابوں میں "آثار الصنادید"، "تفسیر قرآن"، "تبیین الکلام" اور سو سے زیادہ اردو مضامین جو رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے بہت مشہور ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد دہلی کے ایک شریف اور عالم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بھی ادب جدید کی تعمیر کرنے والوں میں ہیں وہ فارسی اور عربی کے عالم تھے اور سنسکرت، ہندی اور انگریزی سے کسی قدر واقف تھے۔ اس کا اثر ان کے ادبی کارناموں میں نظر آتا ہے۔ ان کی نثر خوبصورت، رنگین، شگفتہ، دلکش اور کبھی کبھی شعریت سے پُر ہے۔ ان کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ادبی اسلوب کے مالک تھے۔ یہ اسلوب ان کی ہر قسم کی تحریروں میں نمایاں ہوتا رہتا تھا۔ ان کی کتابیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو ادب کی ترقی کے لئے غیر معمولی خیالات رکھتے تھے اور وہ جذبات کی شکل میں پھوٹ پڑتے تھے۔ ان کی کتابوں میں "آب حیات"، "نیرنگ خیال"، "دربار اکبری"، "سخندان فارس"، "قصص ہند" مشہور ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی اس دور کے اہم ادبی ستون ہیں۔

انھوں نے ملک کی بدلی ہوئی حالت کا احساس کیا اور اپنی شاعری، تنقید اور سوانح نگاری سے اس حالت کی ترجمانی کی۔ خلوص حقیقت پسندی اور سادگی کی خصوصیتیں جس طرح ان کے کردار کا جزو تھیں، اسی طرح ان کے ادبی کارناموں میں بھی ان کی نمود ہوئی تھی۔ جدید ادب کی تحریک کے خد و خال جس طرح حالی کی تحریروں سے واضح ہوتے ہیں، اس طرح کسی اور کے مضامین سے نہیں ہوتے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ مصلح تھے اور قدیم و جدید کے درمیان ایک راستہ تلاش کر رہے تھے لیکن ان کے مضامین اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وہ ادب کو بدلتی ہوئی زندگی کا عکس بنانا چاہتے تھے۔ حالی کا انداز بیان سادہ مگر پر اثر ہے۔ ان کی اہم کتابیں "حیات سعدی"، "یادگار غالب"، "حیات جاوید"، "مقدمہ شعر و شاعری" ہیں، جن کا شمار ادبیات العالیہ میں ہوتا ہے۔

اسی دور میں ڈاکٹر نذیر احمد بھی ہیں جن کے ناولوں، لکچروں اور مذہبی کتابوں نے دور جدید کی اہمیت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اردو نثر کو بھی جاندار، پائدار اور پر اثر بنایا۔ انھوں نے کئی قانونی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے اور قرآن مجید کا عربی سے کیا جن کی اہمیت مسلم ہے۔ بچوں کے لیے کتابیں لکھیں اور ناولوں کے ذریعہ اپنے عہد کی سماجی اور اخلاقی کشمکش کا اظہار کیا۔ ان کے ناولوں میں "مراۃ العروس"، "توبۃ النصوح"، "فسانۂ مبتلا"، "ایامیٰ" اور

"ابن الوقت" مشہور ہیں۔ ان کے ترجمے متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں
ان کے ناول آج بھی شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

مولانا شبلی کے نام کے ساتھ اردو کے "عناصر خمسہ" کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ بیک وقت مورخ، شاعر، فلسفی، سوانح نگار، نقاد، انشار پرداز سب کچھ تھے۔ ان کی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری نے ادب میں نئی راہیں نکالیں اور ان کی تنقید نے ادب کے جمالیاتی اور فنی پہلو روشن کیے۔ ان کی نثر شگفتہ، رنگین اور مدلل ہوتی تھی۔ ان کا قلم سحر کاری کرتا تھا، یہاں تک کہ ان کے مختصر مضامین بھی وزن اور دلکشی کے حامل ہوتے ہیں۔ محقق کی حیثیت سے بعض نقاد ان سے متفق نہیں ہیں لیکن کوئی ان کی اہمیت کا منکر نہیں۔ ان کی کتابوں میں "سیرۃ النبی"، "شعر العجم"، "المامون"، "الکلام"، "موازنہ انیس و دبیر"، "علم الکلام"، "الفاروق" بہت مشہور ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار گو سرسید کے گروپ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ لیکن دورِ جدید کے مسلّم الثبوت نثر نگاروں میں گنے جاتے ہیں۔ سرشار لکھنؤ کی زبان، رہن سہن، رسم و رواج، مذہبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے اس درجہ آشنا تھے کہ دوسرا فن کار ان کے مقابلہ میں مشکل سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ مختلف قسم کے لوگوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور اپنے ناولوں میں انھیں بڑی خوبی سے پیش کر سکتے تھے۔ ان کی نثر میں ظرافت اور متانت کی

آمیزش ہے اور اردو زبان و بیان کا غیر معمولی جادو کارفرما ہے۔ ان کی کتابوں میں "فسانۂ آزاد"، "سیر کہسار"، "جام سرشار"، "خدائی فوجدار" زیادہ اہم ہیں۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے اردو نثر کو اتنا دیا ہے کہ ان کی اہمیت کے اظہار سے کوئی ادبی تاریخ خالی نہیں رہ سکتی۔ انھوں نے تاریخ، ناول، ادبی اور علمی مضامین، سوانح عمری، غرض کہ ہر صنف میں اضافے کیے۔ گو عام طور سے انھیں اسلامی اور تاریخی ناولوں کی وجہ سے اہمیت دی جاتی ہے، لیکن حق یہ ہے کہ ان کی دوسری خدمات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی زبان شستہ بامحاورہ، رنگین اور پر کیف ہوتی ہے۔ ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں:-

"فردوس بریں"، "منصور موہنا"۔ "ایام عرب"، "زوال بغداد"، "فتح اندلس"، "بابک خرمی"، "جویائے حق"، "تاریخ اسلام"، "گذشتہ لکھنؤ" مجموعہ مضامین کی کئی جلدیں، ان کے علاوہ ہیں۔

محسن الملک مہدی علی خاں، جو سرسید کے خاص رفقاء میں سے تھے اردو نثر کو اتنا نہ دے سکے کہ انھیں تاریخ ادب میں ایک اہم ادیب کی حیثیت سے جگہ ملتی، لیکن ان کے وہ ادبی مضامین جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے ہیں انھیں ایک اچھے نثر نگار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح "تہذیب الاخلاق" کے بعض

اور مضمون نگار جن کی صلاحیتیں نمایاں تھیں، خالصتاً ادب کی دنیا کے ہو کر نہ رہ سکے۔

اس دور کے دوسرے ادیبوں میں مولانا ذکاء اللہ کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے مختلف علوم پر بہت سی کتابیں لکھیں اور نثر کا دامن وسیع کیا۔ ان کی زبان سادہ اور مطالب کے ادا کرنے کے لئے مناسب ہے۔ ادبی شان کی کمی ان کے علم سے پوری ہو جاتی ہے۔ ان کی تصانیف میں سب سے اہم تاریخ ہند کی دس جلدیں ہیں جن میں بڑی وسیع النظری سے کام لیا گیا ہے۔

اس دور کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر سید علی بلگرامی، وقار الملک، چراغ علی، اسمٰعیل میرٹھی اور سید احمد دہلوی کے نام نہ لئے جائیں۔ یہ نثر کا خاص دور ہے۔

جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا نثر کی اہمیت بڑھتی گئی اور لکھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ جن بزرگوں کا ذکر ہوا ان کے سامنے ہی بہت سے نئے لکھنے والے اپنی جگہیں بنا چکے تھے اور اپنی تصانیف کے ذریعہ زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اگر صرف ان کے نام گنائے جائیں جنھوں نے تاریخ ادب میں اپنی جگہ پیدا کر لی ہے تو وہ بھی کم نہیں۔ ان کے کارناموں کا جائزہ لینے کے لئے بھی کافی جگہ چاہیے۔ ۱۹۱۰ء کے بعد سے جن نثر نگاروں نے اہمیت حاصل کی ان میں حسن نظامی، راشد الخیری، وحید الدین سلیم

ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد، عبدالحق، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، سید سلیمان ندوی، چکبست، مرزا رسوا، عبدالماجد دریابادی، نیاز فتحپوری، ناصر نذیر فراق، ناصر علی، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالغفار، مسعود حسن رضوی ادیب، رشید احمد صدیقی، پطرس، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر اعجاز حسین، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ڈاکٹر عابد حسین، علی عباس حسینی، شوکت تھانوی، حامد اللہ افسر، فراق نے تاریخ ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ ان میں محقق اور عالم بھی ہیں، سوانح نگار اور انشا پرداز بھی، افسانہ نگار اور ناول نویس بھی ہیں، مزاح نگار اور مترجم بھی۔

اردو نثر کے ارتقاء کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک نئی نسل نے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد اہمیت حاصل کی۔ ان میں مجنوں، آل احمد سرور، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، عزیز احمد، وقار عظیم، ممتاز حسین، اختر اورینوی، کنہیا لال کپور، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تصانیف ادب کے سرمایہ میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اب اگر اصناف کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ناول نگاروں میں مرزا رسوا، راشد الخیری، پریم چند، کرشن چندر،

عزیز احمد، عصمت چغتائی، محمد احسن فاروقی، قرۃ العین حیدر نے فنِ ناول نویسی کو بلند کیا اور اپنے ناولوں سے ہندوستان کے مختلف طبقوں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی۔ ابھی اردو میں ناول کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا ہے جو اسے دوسرے ممالک میں حاصل ہے لیکن یقین ہے کہ اسے مستقبل قریب میں ترقی ہوگی۔ اردو ڈراما بھی دنیا کے ڈراموں کے مقابلہ میں پیچھے ہے آغا حشر، امتیاز علی تاج، اپندر ناتھ اشک، عابد حسین، اشتیاق حسین، میرزا ادیب، محمد مجیب، کرشن چندر، منٹو، احمد عباس، محمد حسن وغیرہ نے چند اہم ڈرامے لکھے ہیں۔ بعض دوسرے اصناف کے مقابلہ میں افسانہ نگاری کو خاص عروج حاصل ہوا۔ سجّاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، پریم چند، علی عباس حسینی، مجنوں، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد عباس، احمد ندیم، عصمت، قرۃ العین، منٹو، حیات اللہ وغیرہ کے افسانے بڑی فنی اور ادبی خوبیاں رکھتے ہیں اور ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی دل کش اور پُراثر ترجمانی کرتے ہیں۔

مزاح نگاروں میں رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی، پطرس، شوکت تھانوی، فرحت اللہ بیگ اور کنہیالال کپور کے کارنامے اردو ادب کے خزانہ میں اضافہ کا موجب ہیں۔

تخلیقی ادب کی دنیا کے باہر تنقیدی اور تحقیقی کام کرنے والوں

کی تعداد بھی کم نہیں ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ کوئی ادب تحقیق اور تنقید کی منزلیں طے کیے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے ادبی سرمایہ کا جائزہ لینا، اُسے خس و خاشاک سے پاک کرنا اور اس کے معیار کا تعین کرنا ضروری ہوتا ہے چنانچہ اس دور میں یہ کام تیزی سے ہوا۔ سلیم پانی پتی، عبدالحق، پنڈت کیفی، سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا بادی، نیاز فتحپوری، عبدالرحمن بجنوری، رشید احمد صدیقی، پروفیسر شیرانی، مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر محی الدین زور، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر فراق، مجنوں، کلیم الدین، سرور، ممتاز حسین، قاضی عبدالودود، اختر اوریںوی، حامد حسین قادری، وقار عظیم، خواجہ احمد فاروقی، ابواللیث، نورالحسن ہاشمی، مسعود حسین خاں، خلیل الرحمن اور بہت سے دوسرے لکھنے والوں نے تنقیدی ادب کے اصولوں کا جائزہ لے کر کھوٹے کھرے کو پرکھنے کی راہ بتائی۔ یہ مختلف الخیال لوگ ہیں اور ان کے لکھنے کا ڈھنگ یکساں نہیں ہے، مگر ان کی ذات سے اُردو نثر کو ہیش از بیش فائدے پہنچ رہے ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ چند نثر نگار اور ہیں جن کی تحریریں علمی انداز میں جدید نثر کی رفتار کو برابر متاثر کر رہی ہیں، جیسے ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، غلام السیدین، عبدالماجد دریا بادی۔

ان کے علمی مضامین ادب کے مختلف پہلوؤں کو برابر فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ تاریخی اور علمی کام کرنے والوں میں شاہ معین الدین ندوی، نجیب اشرف ندوی، صباح الدین عبدالرحمٰن وغیرہ نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

اردو نثر کی یہ مختصر اور سرسری کہانی بڑے پیچ و خم رکھتی ہے یہ فارسی کے سہارے بھی اٹھتی رہی ہے۔ یورپ کے ادبی اسالیب اور خاص کر انگریزی ادب سے بھی فیض اٹھاتی رہی ہے۔ ہندی سے بھی متاثر ہوتی رہی ہے اور اس طرح اس کا دامن وسیع ہوتا رہا ہے۔ فلسفہ، سائنس، تاریخ اور عمرانی علوم کے میدان میں ابھی اسے بہت آگے بڑھنا ہے اور اپنی زندگی اور ترقی کے لئے اسے موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کرنا ہے۔

تمام شد

ASL-278	—	Maths fifth primer 5th [illegible]
		(in Urdu) 1953 — 190 pages.
ASL-279	—	Elements of Calculus
		Sobi-chand, SP Arora, HL Gupta
		universal publishing company Delhi 1956
		222 pages
ASL-280		Urdu Course اردو کورس ([illegible])
		Prof. Syed Ihtisham Husain Allahabad
		J&K university (1968) — 208 pages
ASL-281		Qawaid-i-farsi قواعد فارسی
		156 pages (Persian grammar in Urdu language)

ASL-278	—	Maths fifth [5th] primary [illegible] (in Urdu) 1953 — 190 pages
ASL-279	—	Elements of Calculus Sobi-chand, SP Arora, HL Gupta universal publishing company Delhi 1956 222 pages
ASL-280		Urdu Course [illegible] ([illegible]) Prof. Syed Ikhtishan Husain Allahabad J&K university (1968) — 208 pages
ASL-281		[Qawaid-i-] farsi [illegible]